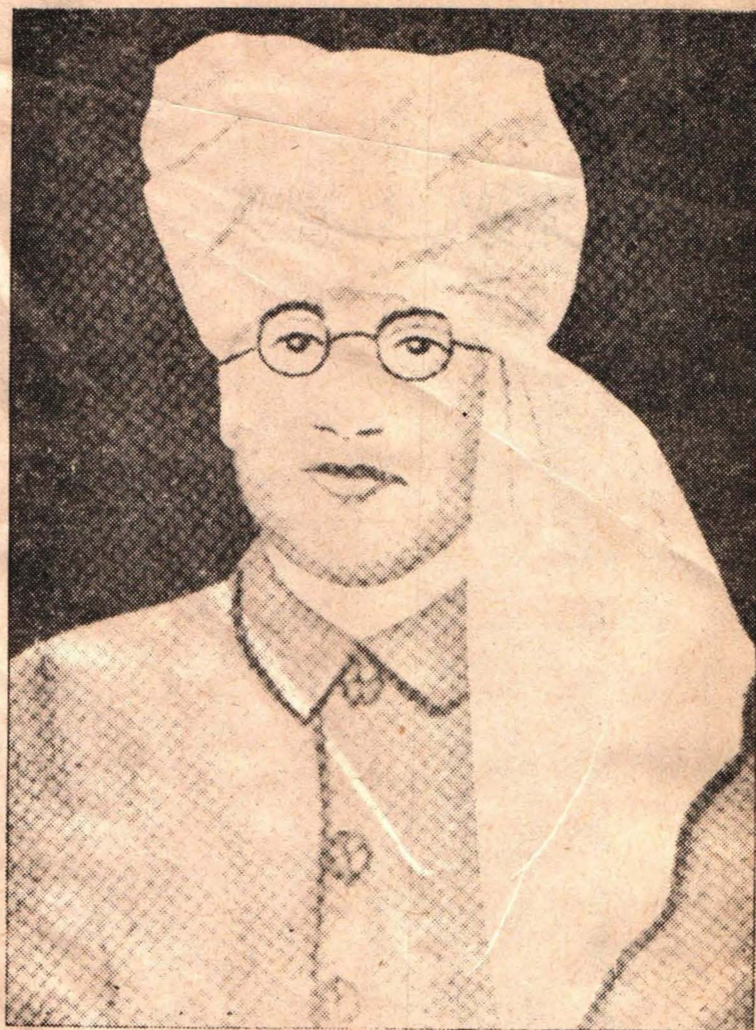
جیل میں آزاد

(مولانا ابوالکلام آزاد کی داستان قید و بند)

محمد فاروق قریشی

۱۹۹۱



مولانا ابوالکلام آزاد......

بسم الله الرحمن الرحيم

جیل میں آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی داستانِ قید و بند

محمد فاروق قریشی

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات



اشاعت اول	1991ء
تعداد	1000
قیمت	100 روپے
بیرون ملک قیمت	۹ امریکی ڈالر
سرورق	انیس یعقوب
پروڈکشن انچارج	گوہر سلطانہ عظمیٰ
اہتمام	مظفر محمد علی
ناشر	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	جنگ پبلشرز پریس
	13۔ سر آغا خاں روڈ لاہور

انتساب

جانثارانِ حرّیت کے نام، جنہوں نے آزادی کی مانگ کو اپنے خون کے سیندور سے سجایا۔

فہرست



محمد فاروق قریشی

تمہید

میں اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست" کے سلسلہ میں مواد کی تلاش میں کتب بینی کر رہا تھا - اس قدر مواد اکٹھا ہو گیا کہ اگر سارے مواد کو اکٹھا کر کے شائع کیا جاتا تو بہت ضخیم [illegible] جاتی۔ ضخامت کے خوف سے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک حصہ متذکرہ بال [illegible] طبع ہے۔ دوسرا "مولانا آزاد کی داستانِ قید و بند" تشنہ کاموں کی خدمت میں پیش [illegible] لانا ابوالکلام کے سوانح" کے نام سے زیرِ تصنیف ہے اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ [illegible] پ کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے...... انشاءاللہ

محمد فاروق قریشی
2۔ سونی سٹریٹ گوالمنڈی لاہور

مولانا ابوالکلام آزاد

ماہ و سال کی جھلک

1888ء۔ ۔ ۔ ۔ پیدائش 22 ر اگست بمطابق 14 ذی الحج 1305ھ بروز بدھ مکہ معظمہ، محلہ قدوہ متصل باب السلام

1893ء۔ ۔ ۔ ۔ رسم بسم اللہ عمر پانچ برس

1898ء۔ ۔ ۔ ۔ والدین کے ہمراہ ہندوستان آمد، والدہ کا انتقال

1899ء۔ ۔ ۔ ۔ شاعری کا آغاز، ماہنامہ "خدنگِ نظر" لکھنؤ میں کلام کی پہلی مرتبہ اشاعت

1901ء۔ ۔ ۔ ۔ 22 ر جنوری ہفتہ وار "المصباح" کا اجراء

1902ء۔ ۔ ۔ ۔ 5 ر جنوری قدیم ترین دستیاب تصنیف "اعلان الحق" ہفت روزہ "احسن الاخبار" کلکتہ کی ادارت

1903ء۔ ۔ ۔ ۔ درسِ نظامی کی تکمیل بعمر پندرہ سال

1903ء۔ ۔ ۔ ۔ مارچ ماہنامہ "خدنگِ نظر" لکھنؤ کے مدیر معاون

1903ء۔ ۔ ۔ ۔ "ایڈورڈ گزٹ" شاہ جہاں پور کے مدیر

1903ء۔ ۔ ۔ ۔ "انجمن ترقی اردو ہند" کی مجلس عامہ کے ممبر، کچھ دنوں کے لئے اسسٹنٹ سیکرٹری بھی رہے

1903ء۔ ۔ ۔ ۔ 20 ر نومبر ماہنامہ "لسان الصدق" کا اجراء

1904ء۔ ۔ ۔ ۔ یکم تا 3 ر اپریل۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پہلی شرکت اور خطاب،

مولانا الطاف حسین حالی سے پہلی ملاقات
1905ء۔۔۔۔ 22ر '23ر اپریل انجمن کے سالانہ اجلاس میں دوسری مرتبہ شرکت "اسلام آئندہ زمانے میں" کے موضوع پر خطاب
1905ء۔۔۔۔ اپریل 'مئی "لسان الصدق" کے آخری شمارہ کی اشاعت
1905ء۔۔۔۔ عظیم انقلابی رہنما شری شیام سندر چکرورتی سے تعارف اور مسلمانوں کو انقلابی سرگرمیوں میں شامل کرنے کا مشورہ
1905ء۔۔۔۔ بیرونی ممالک کا سفر عراق 'مصر 'شام اور ترکی کے انقلابیوں سے ملاقاتیں
1905ء۔۔۔۔ اکتوبر ماہنامہ "الندوہ" لکھنؤ کے مدیر معاون
1906ء۔۔۔۔ مارچ "الندوہ" سے علیحدگی
1906ء۔۔۔۔ نواب صدر یار جنگ سے پہلی ملاقات
1906ء۔۔۔۔ سہ روزہ "وکیل" امرتسر کی ادارت
1906ء۔۔۔۔ ستمبر 'اکتوبر بڑے بھائی ابوالنصر یٰسین آہ کی وفات
1906ء۔۔۔۔ زلیخا بیگم سے شادی
1906ء۔۔۔۔ نومبر میں "وکیل" کی ادارت سے علیحدگی
1906ء۔۔۔۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت۔ اسی اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی
1907ء۔۔۔۔ جنوری ہفت روزہ "دارالسلطنت" کلکتہ کا مولانا کی زیر ادارت از سرِ نو اجراء
1907ء۔۔۔۔ "وکیل" امرتسر کے مالک شیخ غلام محمد کے اصرار پر دوبارہ ادارت سنبھالی
1908ء۔۔۔۔ شیخ غلام محمد سے اخبار کی پالیسی پر اختلافات اور ادارت سے علیحدگی
1908ء۔۔۔۔ 17ر اگست والد کا انتقال 'گاندھی جی کا تعزیتی تار
1908ء۔۔۔۔ عراق میں علامہ آلوسی سے تحصیل۔ مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر۔
1912ء۔۔۔۔ 13ر جولائی ہفتہ وار "الہلال" کا کلکتہ سے اجراء
1912ء۔۔۔۔ 18ر دسمبر مسلم لیگ کی بے حسی پر "الہلال" میں طویل تجزیہ اور تاجِ برطانیہ کے تحت حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کو نصب العین قرار دینے کا مشورہ
1912ء۔۔۔۔ 31ر دسمبر مسلم لیگ نے مولانا کا مشورہ قبول کرتے ہوئے بانکی پور کے اجلاس میں سیلف گورنمنٹ کو نصب العین قرار دیا
1913ء۔۔۔۔ 31ر مئی مولانا حسرت موہانی کے "اردوئے معلّٰی" سے ضمانت طلبی 'حکومت کے اقدام کے خلاف "الہلال" میں پُرزور احتجاج

1913ء۔۔۔۔ یکم ر '8ر اکتوبر "الہلال" میں اخبارات' رسائل اور جرائد کے حقوق کے تحفظ کے لئے انجمن کے قیام کی تجویز اور ابتدائی پروگرام کا خاکہ

1913ء۔۔۔۔ 30ر '31ر دسمبر کے اجلاس مسلم لیگ آگرہ میں شرکت اور سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ کے حق میں تقریر

1914ء۔۔۔۔ 10ر جولائی "الہلال" میں جمعیت حزب اللہ کے قواعد کی اشاعت

1914ء۔۔۔۔ اکتوبر12ر '18ر کا مشترکہ شمارہ "الہلال" ضبط

1914ء۔۔۔۔ 16ر نومبر پچھلی ضمانت ضبط دس ہزار کی نئی ضمانت طلبی' مطالبہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے 18ر نومبر کی اشاعت کے بعد "الہلال" خود ہی بند کر دیا

1915ء۔۔۔۔ اگست مدرسہ "دارالاشاد" کا قیام

1915ء۔۔۔۔ 15ر نومبر ہفتہ وار "البلاغ" کا کلکتہ سے اجراء

1915ء۔۔۔۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی میں شرکت' دوسری جماعتوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے حق میں زبردست تقریر

1916ء۔۔۔۔ مارچ حکومت بنگال کی طرف سے ڈیفنس ایکٹ نمبر3 کے تحت چار یوم کے اندر صوبہ بنگال سے نکل جانے کا حکم نامہ بعد میں یہ مدت بڑھا کر ایک ہفتہ کر دی۔ دہلی' پنجاب اور یوپی کی صوبائی حکومتوں نے پہلے ہی اپنے صوبوں میں داخلہ پر پابندی لگا رکھی تھی۔

1916ء۔۔۔۔ 30ر مارچ۔ کلکتہ سے صوبہ بہار کے شہر رانچی روانگی' شہر سے باہر ایک گاؤں مورابادی میں قیام' صوبہ بدر ہونے کے باعث "البلاغ" کی اشاعت ختم

1916ء۔۔۔۔ 8ر جولائی۔ حکومت ہند کی طرف سے نظربندی کا حکم' پریس اور گھر کی تلاشی' گرانقدر مسودات کا اتلاف

1919ء۔۔۔۔ "تذکرہ" اور "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد"

1919ء۔۔۔۔ 27ر دسمبر۔ شاہی فرمان کے ذریعے تمام سیاسی اسیروں کی رہائی

1920ء۔۔۔۔ 20ر جنوری۔ رہائی کے بعد دہلی آمد' گاندھی جی سے پہلی مرتبہ ملاقات' وائسرائے سے ملاقات کے لئے جانے والے وفد میں شمولیت سے انکار' یادداشت پر دستخط

1920ء۔۔۔۔ 28ر 29ر فروری۔ "مذہب عمل میں تجدید" جلسوں کا صدر نہ بننے کا پرانا دستور العمل ختم' بنگال پراونشل خلافت کانفرنس کی صدارت' مسئلہ خلافت پر جامع' مبسوط اور طویل ترین خطبہ صدارت' بعد میں یہی خطبہ "مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا

1920ء۔۔۔۔ 23ر مارچ میرٹھ خلافت کانفرنس میں شرکت اور گاندھی جی کے بعد تقریر

1920ء۔۔۔۔ 7ر تا9ر فروری۔ خلافت کانفرنس لاڑکانہ سے خطاب

1920ء۔۔۔۔ 12ر دسمبر۔ جامع مسجد ناخدا کلکتہ میں قومی عربی مدرسہ کا قیام اور افتتاحی تقریب سے مولانا اور

گاندھی جی کا خطاب

1921ء۔۔۔۔ مارچ۔ گاندھی جی کے ساتھ پنجاب کا دورہ' لاہور اور امرتسر میں عام اجتماعات پر پابندیوں کے باوجود مولانا نے قانون شکنی کرتے ہوئے تقاریر کیں

1921ء۔۔۔۔ اپریل۔ موپلوں کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے کالی کٹ کا سفر' مدراس اور اروڈ میں قیام و خطاب

1921ء۔۔۔۔ 18ر اگست۔ مقدمہ کراچی کے ملزمان کی گرفتاری کے خلاف ہالیڈے پارک کلکتہ کے جلسۂ عام میں تقریر' جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں کراچی ریزولیوشن کی حمایت میں تقاریر

1921ء۔۔۔۔ 23ر ستمبر۔ تحریک عدم تعاون کی دعوت عام کرنے کے لئے ہفتہ وار "پیغام" کا کلکتہ سے اجراء

1921ء۔۔۔۔ 18ر 20ر نومبر۔ صدارت اجلاس جمعیت علمائے ہند لاہور' دونوں جگہوں پر کراچی ریزولیوشن کی پُرزور تائید کی

1921ء۔۔۔۔ 10ر دسمبر۔ گرفتاری

1922ء۔۔۔۔ 24ر جنوری۔ عدالت میں تحریری بیان داخل کیا جو بعد میں "قولِ فیصل" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا

1922ء۔۔۔۔ 9ر فروری۔ بغاوت کے مقدمہ میں دفعہ 124۔ الف کے تحت مجرم' ایک سال قید با مشقت کی سزا

1923ء۔۔۔۔ 6ر جنوری۔ قید سے رہائی

1923ء۔۔۔۔ یکم اپریل۔ عربی رسالہ "الجامعہ" کا اجراء

1923ء۔۔۔۔ 15ر دسمبر۔ صدارت کانگریس کے سپیشل اجلاس دہلی کانگریس کے کم عمر صدر' کانگریس کے دونوں مختلف الخیال گروہوں میں مفاہمت کرائی

1925ء۔۔۔۔ 22ر مئی۔ حصولِ پاسپورٹ کے لئے درخواست

1925ء۔۔۔۔ 29ر دسمبر۔ صدارت آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور

1926ء۔۔۔۔ فرقہ وارانہ فسادات کے خاتمہ کے لئے مساعی

1927ء۔۔۔۔ فرقہ وارانہ فسادات کے خاتمہ کے لئے جلسۂ عام سے خطاب کلکتہ

1927ء۔۔۔۔ 10ر جون۔ "الہلال" کا دوبارہ اجراء

1927ء۔۔۔۔ 9ر دسمبر۔ اس کے بعد "الہلال" ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا

1929ء۔۔۔۔ 27ر جولائی۔ صدر مسلم نیشنلسٹ پارٹی اور نہرو رپورٹ کی حمایت

1930ء۔۔۔۔ قائم مقام صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس

1930ء۔۔۔۔ 21ر اگست۔ گرفتاری

1931ء۔۔۔۔ 27 ر جنوری۔ رہائی

1931ء۔۔۔۔ 31 ر مارچ ' یکم اپریل۔ جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کراچی کی صدارت

1931ء۔۔۔۔ ستمبر ترجمان القرآن کی جلد اوّل کی اشاعت

1932ء۔۔۔۔ 12 ر مارچ۔ گرفتاری

1932ء۔۔۔۔ 11 ر مئی۔ رہائی

1932ء۔۔۔۔ ستمبر۔ جمعیت اہل حدیث کانفرنس کلکتہ سے خطاب

1936ء۔۔۔۔ اپریل۔ ترجمان القرآن جلد دوئم کی اشاعت

1937ء۔۔۔۔ انتخاب کے بعد وزارت سازی کے سلسلہ میں یوپی اور بہار کے دورے ' یوپی میں مسلم لیگ کے چودھری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خاں کے ساتھ کانگریس مسلم لیگ مخلوط کابینہ بنانے کا معاہدہ ' بہار میں ڈاکٹر سید محمود اور بمبئی میں مسٹر نریمان کو صوبائی اسمبلیوں کی کانگریس پارٹی کا قائد بنانے کی کوشش

1937ء۔۔۔۔ 6 ر دسمبر۔ کانگریس کی جانب سے قومی ترانہ کے انتخاب کے لئے کمیٹی کی رکنیت

1938ء۔۔۔۔ حمید نظامی کی دعوت پر لاہور میں منظور قادر کے مکان پر مسلم سٹوڈنٹس سے خطاب

1940ء۔۔۔۔ 17 ر تا 19 ر مارچ کانگریس کا 52 واں اجلاس رام گڑھ میں بھاری اکثریت سے صدر چنے گئے اس عہدہ پر 1946ء تک فائز رہے ' زبردست خطبۂ صدارت ' جس میں تمام مسائل کا احاطہ کیا خاص کر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے وفاق کا حل تجویز کیا

1940ء۔۔۔۔ 14 ر مارچ۔ پندرہ روزہ "نوائے وقت" لاہور کے اجراء پر تہنیتی پیغام

1940ء۔۔۔۔ 14 ر دسمبر۔ پنجاب سے کلکتہ جاتے ہوئے الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر صبح کی چائے پینے کے لئے ریفرشمنٹ روم جاتے ہوئے گرفتاری اور دو برس کی سزا نینی جیل میں قید

1941ء۔۔۔۔ 4 ر دسمبر۔ رہائی باردولی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ' گاندھی جی سے خیالات میں بعد میں اضافہ

191ء۔۔۔۔ 9 ر فروری۔ چیانگ کائی شک سے ملاقات

194ء۔۔۔۔ 23 ر مارچ۔ کرپس کا ہندوستان میں ورود ' 25 ر مارچ کرپس سے ملاقات

1942ء۔۔۔۔ 10 ر اپریل۔ ایک خط کے ذریعہ کرپس تجاویز مسترد کرنے کی اطلاع

1942ء۔۔۔۔ مئی ' جون۔ ہندوستان پر جاپانی حملہ کی صورت میں اقتدار سنبھالنے کی منصوبہ بندی

1942ء۔۔۔۔ 14 ر جولائی تا 5 ر اگست۔ دورۂ ہندوستان ' تحریک کے بارے میں مقامی رہنماؤں کو ہدایات

1942ء۔۔۔۔ 29 ر جولائی۔ اقتدار مسلم لیگ کو منتقل کر دینے کی پیش کش

1942ء۔۔۔۔ 9 ر اگست۔ بمبئی میں علی الصبح گرفتاری اور قلعہ احمد نگر میں نظر بندی

1943ء۔۔۔۔ 9 ر اپریل۔ کلکتہ میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال

1945ء۔۔۔۔ اپریل۔ احمد نگر سے بانکوڑہ منتقلی

1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 15 ر جون ۔ رہائی
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 24 ر جون ۔ وائسرائے لارڈ ویول سے ملاقات
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 25 ر جون ۔ پہلی شملہ کانفرنس میں شرکت
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 7 ر جولائی ۔ نئی ایگزیکٹو کونسل کے لئے پندرہ ناموں پر مشتمل فہرست وائسرائے کو دی
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 14 ر جولائی ۔ پہلی شملہ کانفرنس کی ناکامی پر ردِ عمل
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 15 ر جولائی ۔ وائسرائے کے نام خط' کانگریس پر عائد پابندی ختم کرنے' سیاسی قیدیوں کی رہائی اور پریس کی آزادی کا مطالبہ
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ جولائی ۔ علی گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر لیگی طلباء کا مخالفانہ مظاہرہ
1945ء۔ ۔ ۔ ۔ 2 ر اگست ۔ گاندھی جی کے نام مکتوب' مسلمانوں کے خدشات دور کرنے کے لئے بعض نئی تجاویز
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ غبارِ خاطر' کاروانِ خیال کی اشاعت
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ مارچ ۔ وزارت سازی کے لئے لاہور آمد' پنجاب میں پہلی مرتبہ کانگریس کو اقتدار میں لانے میں کامیابی' کانگریس' یونی نسٹ اور اکالی مخلوط کابینہ قائم کرنے کا فیصلہ
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 2 ر' 4 ر اپریل ۔ حکومت اور مسلم لیگ پر انتخابات میں مداخلت اور دھاندلی کے الزامات
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 6 ر اپریل ۔ برطانوی کابینہ مشن سے ملاقات' صوبوں کو زیادہ اور مرکز کو کم اختیارات دے کر اقلیتوں کو مطمئن کرنے کا فارمولا
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 15 ر اپریل ۔ مشن کو پیش کردہ تجاویز کا پریس کانفرنس میں انکشاف
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 22 ر اپریل ۔ صدارت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام کی تجویز
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 7 ر جولائی ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں پنڈت جواہر لال نہرو کا نام صدارت کے لئے پیش کیا
1946ء۔ ۔ ۔ ۔ 9 ر جولائی ۔ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے لئے صوبہ سرحد سے انتخاب میں حصہ لئے کاغذات نامزدگی پشاور پہنچے ۔ مولانا اور باچا خاں ممبر منتخب ہوئے
1947ء۔ ۔ ۔ ۔ 15 ر جنوری ۔ عبوری حکومت میں بطور وزیر تعلیم شمولیت
1947ء۔ ۔ ۔ ۔ 19 ر فروری ۔ فرقہ وارانہ یونیورسٹیوں کے قیام کی مخالفت
1947ء۔ ۔ ۔ ۔ 31 ر مارچ ۔ گاندھی جی سے دہلی میں نہایت اہم ملاقات' ملک کو تقسیم سے پر اتفاق رائے
1947ء۔ ۔ ۔ ۔ 2 ر اپریل ۔ گاندھی جی تقسیم کے حق میں' مولانا کے لئے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ
1947ء۔ ۔ ۔ ۔ 14 ر مئی ۔ لارڈ مونٹ بیٹن سے شملہ میں ایک گھنٹہ تک ملاقات' کابینہ مشن پلان کو بچانے کی آخری کوشش' انتقالِ اقتدار دو ایک برس کے لئے ملتوی کرنے کی تجویز

1947ء۔۔۔۔ 14ر جون۔ آل انڈیا کانگریس میں تین جون پلان "تقسیم ہند منصوبہ کی مخالفت
1947ء۔۔۔۔ 29ر جون۔ دونوں مملکتوں کی دستور ساز اسمبلیوں کا مشترکہ اجلاس بلا کر اقلیتوں کے تحفظ کے لئے متفقہ لائحۂ عمل مرتب کرنے کا مشورہ
1947ء۔۔۔۔ 21ر جولائی۔ آئین ساز اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ
1947ء۔۔۔۔ 15ر اگست۔ آزاد ہندوستان کی پہلی کابینہ میں وزیر تعلیم
1947ء۔۔۔۔ اکتوبر شاہی مسجد دہلی میں مسلمانوں سے خطاب
1948ء۔۔۔۔ مارچ۔ ترکِ وطن کر کے جانے والے مسلمانوں کو تنبیہ
1949ء۔۔۔۔ اپریل۔ انڈین نیشنل کمیشن فار کوآپریشن ود یونیسکو کے افتتاحی اجلاس میں خطبۂ صدارت
1951ء۔۔۔۔ کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر
1951ء۔۔۔۔ جولائی۔ غیر ممالک کا دورہ کراچی میں مختصر قیام 'مسٹر جناحؒ کے مرقد پر فاتحہ خوانی
1951ء۔۔۔۔ جولائی۔ ایران میں آیت اللہ خمینی سے ملاقات
1952ء۔۔۔۔ آزاد ہندوستان کے پہلے عام انتخاب میں لوک سبھا کے منتخب ممبر' مرکزی کابینہ میں تعلیم' قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیقات کے محکموں کے وزیر
1953ء۔۔۔۔ اپریل۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رڑکی کی مرکزی عمارت کا افتتاح
1954ء۔۔۔۔ اگست۔ للت کلا اکاڈیمی کے افتتاحی اجلاس سے صدارتی خطاب
1955ء۔۔۔۔ 25ر مئی۔ بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعہ انگلستان روانگی' رات کراچی میں قیام' پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرا سے ملاقات
1955ء۔۔۔۔ 29ر جولائی۔ انڈیا آفس لائبریری کو برطانیہ کی ملکیت تسلیم کرنے سے انکار
1956ء۔۔۔۔ یونیسکو کی نویں جنرل کانفرنس دہلی کے صدر
1957ء۔۔۔۔ ہندوستان کے دوسرے عام انتخاب لوک سبھا کے منتخب ممبر
1957ء۔۔۔۔ اپریل۔ بطور وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات حلف برداری
1958ء۔۔۔۔ 15ر فروری۔ انجمن ترقی اردو ہند کے اجلاس دہلی میں تقریر
1958ء۔۔۔۔ 19ر فروری۔ علی الصبح فالج کا شدید حملہ 'تین یوم تک بے ہوش
1958ء۔۔۔۔ 22ر فروری۔ وفات صبح دو بج کر دس منٹ' سہ پہر تین بجے جامع مسجد کے زیر سائے اردو پارک میں دفن کئے گئے۔ نماز جنازہ مولانا احمد سعید نے پڑھائی

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

سورج کا سفر

قید.......... اس تین حرفی لفظ میں کس قیامت کے معنی پنہاں ہیں اس کا اندازہ مجھے اگرچہ اس مضمون کو لکھنے سے قبل بھی تھا کیونکہ اس کی بہت سی شکلیں مجھے دن رات اس پورے نظام میں ہر جگہ نظر آتی رہتی ہیں۔ مجھے جیلوں کا مقصد کبھی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ہم نے اپنے پورے سماج کو ایک جیل کی شکل دے رکھی ہے اور انسان جو پیدائشی طور پر آزادی کا حق رکھتا ہے وہ گویا ابھی تک ماں کی کوکھ سے جنم ہی نہیں لے سکا ہے۔ ایک مخصوص نظام اور ایک محدود گنجائش میں ' ایک خاص سمٹے اور سکڑے ہوئے اس مقیّد انسان کا جنم کب ہو گا؟ اس سوال نے میرے سامنے کئی چہرے لا کھڑے کئے ہیں وہ چہرے بھی کسی اجتماعی مقصد کیلئے انفرادی طور پر قید و بند کی اذیّتیں برداشت کرتے رہے اور وہ انسان بھی جو اپنے اپنے سماجی رُتبے اور مقام کیلئے یعنی اپنے انسان ہونے کا حق مانگنے کی لڑائی میں گمنام مجاہدوں کی طرح لڑتے رہے اور اب بھی لڑ رہے ہیں۔ ایسے گھٹن زدہ معاشرے اور دیمک زدہ سماج میں ضمنی جیلوں کی ضرورت ویسے بھی نہیں بچتی ' اور اس صورت میں ان کی حیثیت اور مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جب لوگ جیلوں میں اسی طرح آزاد رہتے ہیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ آزاد نہ تو اس رستے کے پہلے مسافر تھے اور نہ ہی آخری لیکن جن کے نقشِ قدم پر وہ چلے اور اپنے نقشِ قدم جن کیلئے چھوڑ گئے ان کا ذکر مضحکہ خیز نہیں بلکہ حکایت خونچکاں کی مانند ہے ' یہ داستان مزے لے لیکر بیان نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کو لکھتے ہوئے بعض اوقات

دل لہواور انگلیاں فگار جیسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہیں جہدِ مسلسل اور عزمِ لازوال جیسے الفاظ محض کاغذی حرف نہیں لگتے ان کے مفہوم اور معنی سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور دل خود بخود کسی ایسی آگ میں کود پڑنے کیلئے آمادہ ہونے لگتا ہے جس کی چنگاریوں سے ظلمتِ شب کا سینہ چاک ہو سکے۔

یہ بھی کیسا عجیب المیہ ہے (المیے عجیب ہی ہوتے ہیں) کہ بہت سے لوگ محض اس لئے جرم کرتے ہیں کہ انہیں جیل جاکر دووقت کی روٹی مل جاتی ہے شاید اسی لئے ہمارے ملک کے ایک عظیم آمر نے کہا تھا کہ پاکستان میں کوئی شخص بھوکا نہیں سوتا اسے یقین تھا کہ مجرموں کیلئے جیل ہے اور جو مجرم نہیں ہے اور ضمیر کا قیدی ہے اس کیلئے بھی قید اور اذیّت ہے۔ اس حوالے سے تو دنیا بھر میں کوئی شخص بھوکا نہیں سوتا ہو گا۔

مجھے یہ بات بھی دلچسپ لگتی ہے کہ ہمارے ملک میں کسی فن کیلئے حکومت کی طرف سے کوئی باضابطہ اکیڈمی نہیں ہے لیکن جیل کی اکیڈمی کو دن رات ایڈوانس کیا جارہا ہے۔ میں جیل کو صرف اخلاقی مجرموں کے حوالے سے نہیں دیکھ رہی اس لئے کہ ان ہی جیلوں میں سیاسی قیدی بھی رکھے گئے اور جہاں اخلاقی مجرم جیل میں اپنے جرم میں مزید طاق ہو کر نکلے وہیں سیاسی قیدی اپنے نظریات میں مزید بے باک ہو کر باہر آئے اور نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے جسم کی اس قید اور روح کے ان تازیانوں میں بھی اپنی قوتِ ارادی، اپنی کمٹ منٹ اور اپنے عوام سے رابطہ برقرار رکھا۔

بظاہر قید بغاوت کا نتیجہ ہوتی ہے بغاوت تو شیطان نے بھی کی لیکن قدرت کے نظام نے اس باغی کو آزاد چھوڑ دیا۔ شاید آسمانی قوّتوں کا ذہن جانتا ہو گا کہ قید میں رہ کر باغی انقلابی بن سکتا ہے اس لئے شیطان کو انقلابی کے بجائے اشتہاری مجرم بنانا زیادہ بہتر فیصلہ رہا اور وہ ہمیشہ کیلئے نسلِ انسانی کا دشمن قرار پا گیا کیونکہ آسمانی کتابوں نے اس کی بغاوت کو منفی قرار دیا تھا لیکن باوجود اس کے یہ بات بجائے خود اہم ہے کہ اپنے سے بڑی طاقت کے آگے انکار کی جرأت کرنا ایک بڑا اقدام تھا یہی چیز شیطان کی بغاوت کی واحد خوبی ہے۔ اس کے بعد محقّقین انسانی تاریخ میں پرومی تھیئس کی بغاوت کا ذکر کرتے تھے لیکن جو تحقیق اب سامنے آئی ہے اس کے مطابق جب یہودی توریت کی ترتیب میں شیطان کی بغاوت کا قصہ رقم کر رہے تھے تو اس سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل یونان کا ایک کسان ہیسیڈ (۷۵۰ ق۔م) پرومی تھیئس کی بغاوت کا قصہ رقم کر چکا تھا گویا تاریخ کی رُو سے پرومی تھیئس شیطان سے بھی پہلے باغی قرار پایا جا چکا تھا۔ پرومی تھیئس کے معنی دُور اندیش کے ہیں اس کا نشان سورج کی علامت ہے۔

تاریخ میں ہمیں دو طرح کی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے ایک آسمانی طاقتوں کے خلاف اور دوسری ارضی اور سماجی رشتوں کے خلاف، مثلاً کسانوں، غلاموں اور دستکاروں کی اوّلین بغاوت جو اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں ہوئی، سماجی اور ارضی قوّتوں کے خلاف تھی یہ بغاوت کسی بڑی تبدیلی کا باعث نہیں بنی کیونکہ اس میں ترتیب اور ڈسپلن کا فقدان تھا پھر پیداواری قوّتیں بھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ بغاوت کے فوراً بعد اقتدار پر قبضہ کر کے کسی نئے نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی لیکن یہ بغاوت پانی میں پھینکے جانے والے پہلے کنکر کے برابر تھی جس کے باعث فرعون کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور تمام امیر طبقہ اپنے رہائشی محل چھوڑ کر بھاگ گیا باغیوں نے فرعونوں کی دفن شدہ دولت لُوٹ لی اور تمام مال و متاع پر قابض ہو گئے اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے دولت مند آقاؤں سے غلاموں کی طرح کام لینا شروع کر دیا جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ بغاوت کسی بڑی سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ نہیں تھی لیکن اس سے دہقانوں اور کسانوں کو کچھ نہ کچھ مراعات ضرور ملی ہوں گی پھر یہ کہ اس کے اثرات سے اس وقت دنیا کی معاشی حیثیت میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہو گی اس کا نفسیاتی اثر سب سے اہم تھا کہ امراء اور روساء کیلئے یہ خوف ایک مستقل عذاب بن گیا ہو گا کہ کُچلا ہوا اور دبا ہوا طبقہ اقتدار پر قابض ہو سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ طبقاتی معاشرے کا فطری منفی ردِّعمل تھا۔ ...... سبط حسن کے الفاظ ہیں۔

"آسمانی طاقتوں کے خلاف بغاوت کا تصوّر چونکہ ارضی طاقتوں کے خلاف بغاوت ہی سے وابستہ ہے لہٰذا بغاوت کی سماجی نوعیت پر غور کرنا بے محل نہ ہو گا بغاوت نام ہے حکومتِ وقت یا مروّجہ قوانین و ضوابط، یا مروّجہ عقائد و اقدار سے اعلانیہ انحراف کا، بغاوت فکر و عمل کا منفی انداز ہے جو حال کے جبر سے نشوونما پاتا ہے باغی کو اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ جس تخریب کے وہ درپے ہے اس کے ملبے پر کوئی بہتر عمارت کھڑی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ حال کی سخت گیریاں اس پر اتنی حاوی ہوتی ہیں کہ وہ مستقبل کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا"۔

مجھے یہاں سبط حسن کے ان الفاظ سے اختلاف ہے کہ بغاوت فکر و عمل کا منفی انداز ہے کیونکہ تاریخ کی زیادہ تر بغاوتیں معاشرتی ارتقاء کی اس منزل تک پہنچتی نظر آتی ہیں جہاں فکر و عمل کا انداز اگر منفی تھا بھی تو مثبت بن جاتا ہے جب فرد اپنی لڑائی لڑ رہا ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ منفی ہی ہو، لیکن جب اس لڑائی میں وہ اچانک محسوس کرتا ہے کہ اور بھی بہت سے لوگ شامل ہو رہے ہیں اور یہ ذاتی جنگ اجتماعی تبدیلی کا راستہ بن رہی ہے تو اس کی سوچ اور عمل مثبت ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ اب اس کی سوچ اور عمل کے سامنے چونکہ ایک ٹھوس اور واضح منزل موجود ہوتی

ہے اس لئے وہ مثبت قرار پاتا ہے لیکن جب غلاموں کے پاس کھونے کیلئے زنجیروں کے سوا کچھ بھی نہ ہو تو پھر کیا چیز انہیں بغاوت سے روکے اور کیوں روکے؟۔

یونانی دیومالائی کہانیوں میں کرونس جب مالکِ کائنات ہوا تو اس کے بیٹے زیوس نے اقتدار کیلئے اس سے جنگ لڑی جس میں زیوس کے صرف ایک بھائی "دوراندیش" پرومی تھیئس نے اس کا ساتھ دیا' باقی اپنے باپ کے ساتھ تھے کرونس مارا گیا اور زیوس کائنات کا مالک بنا اس نے خوش ہو کر پرومی تھیئس کو دیوتا کا درجہ دیا۔ ایتھینا دیوی' جو عقل و دانش کی دیوی تھی اس نے پرومی تھیئس کو بہت سے علوم سکھائے جس میں کھیتی باڑی' گھر بنانا' علمِ نجوم' معدنیات' طب ریاضی اور جہاز رانی شامل تھے۔ پرومی تھیئس نے یہ تمام علوم انسانوں کو سکھا دیئے۔ زیوس کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ انسان اس پر انحصار کرنا چھوڑ دیں لہٰذا اس نے نسلِ انسانی کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پرومی تھیئس نے زیوس کو اس اقدام سے باز رکھنا چاہا مگر وہ نہیں مانا تب پرومی تھیئس نے سورج سے ایک شمع روشن کی اور وہ انسانوں کو دے آیا۔ گویا انسان کے ہاتھ آگ کا نسخۂ کیمیا آ گیا۔ آگ کا علم انسان کے ہاتھ میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب کائنات کے ہر راز سے واقف ہو گیا۔ آگہی کا ہر در انسان پر کھُل گیا یہی وہ جرُم تھا جس پر انسان جنت سے نکالا گیا تھا انسان کو آگہی دینے کے اس جرُم میں شیطان معتوب قرار پایا اگرچہ وہ اس کے باوجود منفی تھا مگر پرومی تھیئس انسان کا دوست تھا لہٰذا زیوس نے پرومی تھیئس کو گرفتار کر کے کوہ قاف کی سب سے اونچی چوٹی پر باندھ دیا جہاں ایک گدھ دن بھر پرومی تھیئس کا کلیجہ نوچ نوچ کر کھاتا تھا۔ زیوس کی شرط یہ تھی کہ پرومی تھیئس اپنے جرُم کا اعتراف کرے' معافی مانگے اور انسان سے آگ کا نسخہ واپس لے کر آئے۔ پرومی تھیئس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا مگر اس کا کہنا تھا کہ مجھ سے زیادہ آزاد کون ہو سکتا ہے جسے تم جان سے مار بھی نہیں سکتے کوہ قاف کی چوٹی اس لحاظ سے دنیا کا پہلا جیل خانہ تھی جہاں ایک باغی اور سیاسی قید تھا اور جس نے حاکمِ وقت کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ آگ کے اس راستے پر تب سے ہر باغی نے چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جو انسان کیلئے اس کائنات میں بہتری اور خوشی کے راستے بنانا چاہتے ہیں انہیں اسی طرح اپنے سینے پر ایک گدھ بٹھانا پڑتا ہے جو ان کا کلیجہ نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔ یونانی ڈرامہ نویس ایس کائی لس نے لکھا ہے۔

نسلِ انسانی پر تمہاری شفقت و عنایت نے تم کو یہ دن دکھائے ہیں
تم وہ دیوتا ہو جو دیوتاؤں کے عتاب کے آگے نہیں جھکا
لیکن تم اپنی حد سے آگے بڑھ گئے

اور فانی انسان کو مراعات دے دیں

اب اس پاداش میں تم اس چٹان کا پہرہ دو

اب ذرا ان مکالموں پر نظر ڈالئے جو پرومی تھیئس اور پریوں کے کورس کے درمیان ہوا۔

کورس..... ۔ تم نے انسانوں کے دکھوں کی کیا دوا تجویز کی ؟۔

پرومی تھیئس..... ۔ میں نے ان کے دلوں میں امید کے سدا بہار پھول کِھلا دیئے۔

کورس..... ۔ یہ تحفہ تو ان کیلئے بڑی نعمت ثابت ہو گا؟۔

پرومی تھیئس..... ۔ میں نے ان کو اس سے بھی بڑی چیز عطا کر دی میں نے آگ ان کے حوالے کر دی۔

کورس..... ۔ انسانوں کو.......... ' جن کی زندگی چند روزہ ہوتی ہے گویا وہ اب آگ کی گرم روشنی کے مالک ہیں۔

پرومی تھیئس ..... ۔ ہاں اور اس کی مدد سے اب وہ ان گنت ہنروں کے ماہر ہو جائیں گے۔

یہاں یہ سوال اہم ہے کہ آگ میں ایسی کیا خاص بات تھی جو زیوس انسانوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ آگ دراصل ایسا کیمیائی عمل ہے جس سے مادی اشیاء کی حالت تبدیل ہوتی ہے نئی حالت بنتی ہے گویا آگ کائنات کی سب سے بڑی انقلابی قوّت ہے۔ روما کے سائنس دان پلائنی کبیر (۲۳۔ ۷۹ء) کے ایک مضمون کا اقتباس دیکھئے۔

میں نے انسان کی قوّتِ ایجاد کا تذکرہ مکمل کر لیا مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ تقریباً ہر موقع پر آگ ہی نے فعال کردار ادا کیا ہے۔ آگ ریت کو کبھی شیشے میں بدلتی ہے' کبھی چاندی میں' کبھی شنجرف میں' کبھی طرح طرح کے جستوں میں' کبھی رنگوں میں اور کبھی دواؤں میں۔ آگ ہی سے پتھر کو پگھلا کر کانسہ بناتے ہیں' لوہے کو ڈھالتے ہیں اور سونا تیار کرتے ہیں۔ آگ ہی کنکر کو پتھر کو جلا کر چُونا بنا دیتی ہے جس سے ہم اپنے گھروں کی چھتوں دیواروں کو مستحکم کرتے ہیں پھر ایک ہی شے پہلی آنچ میں کچھ ہوتی ہے' دوسری آنچ میں کچھ اور تیسری آنچ میں کچھ اور مثلاً کوئلے میں بُجھنے کے بعد ہی طاقت آتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں اب دم نہیں رہا۔ حالانکہ اس کی طاقت اور بڑھ چکی ہوتی ہے او آگ۔ 'قدرت کا وہ مظہر جس کی نہ اتھاہ ہے نہ جس کا پیٹ کبھی بھرتا ہے ہم تجھ کو کیا کہیں؟ خالق یا ہالک ؟۔

ایک ہی شے پہلی آنچ میں کچھ دوسری آنچ میں کچھ اور تیسری میں کچھ ہے اس بات میں سارا فلسفہ موجود ہے یہیں سے سائنس اور مذہب کا وہ ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جس نے جیور دانو برونو کو

دُور بین کی ایجاد کے جرُم میں چرچ کے ہاتھوں زندہ جلا دیا سائنس کی ترقی 'اور آگہی کی روشنی نے مذہب کے ایوانِ اقتدار کو لرزا کر رکھ دیا مگر گالیلو نے جل کر مر جانے کی بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا اس نے دُور بین سے ثابت کیا کہ مذہب کا یہ کہنا کہ آسمان گردش کرتا ہے اور زمین ساکن ہے غلط ہے بلکہ زمین گردش کرتی ہے اور وہ بھی سورج کے گرد جبکہ آسمان ایک ساکن غبار ہے۔ گالیلو کے اس نظریئے نے چرچ میں ہنگامہ بپا کر دیا اسے حکم ہوا کہ وہ اپنے نظریئے کو غلط قرار دے اور کہے کہ اس نے جو کچھ کہا تھا بدعت تھا ورنہ اس کو محکمہ احتساب کے حوالے کر دیا جائے گا جو اس پر تشدّد کر کے یہ سب کہلائیں گے جو وہ کہلانا چاہتے ہیں۔ گالیلو نے کہا میں کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا وہ بدعت تھا آسمان گردش کرتے ہیں اور زمین ساکن ہے پھر وہ آگے بولا مگر یہ کہنے سے کیا ہوتا ہے زمین تو پھر بھی گردش کرتی رہے گی اس کے بعد گالیلو کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا یہ نظر بندی اس کیلئے ایک نعمت ثابت ہوئی اس نے اس قیدِ تنہائی میں سائنسی انکشافات کے ڈھیر لگا دیئے اور اس کی دو کتابیں چوری چھپے ملک سے باہر چھپ گئیں غرض فزکس اور جغرافیہ کی دنیا میں انقلاب آ گیا مگر کمال یہ تھا کہ جب بھی گالیلو کو عدالت میں بلایا جاتا وہ حاکمِ وقت سے معافی مانگتا اور قید میں جا کر اپنا کام شروع کر دیتا گویا اس نے جیور دانو برونو کے زندہ جلائے جانے سے یہ سبق سیکھا کہ رجعت پسند طاقتوں کے ہاتھوں مر کر اپنا کام بند کر دینے سے بہتر ہے کہ ایک نہ ایک راستہ کھلا رکھا جائے گالیلو ایسا نہ کرتا تو آج سائنسی ترقی میں ہم پتہ نہیں کتنے برس پیچھے ہوتے۔

یہاں پر مولانا کا وہ دور سامنے رکھیں تو صورتِ حال میں کتنی مماثلت نظر آتی ہے دو مختلف شعبوں کے انسان مگر جن کا مکتبۂ فکر انسانیت کی بھلائی اور عوام دوستی تھا ایک جیسے حال میں نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد کو بنگال سے جلاوطن کیا گیا تھا اور وہ رانچی میں تھے تو انہوں نے وہاں کے لوگوں کی حالت دیکھ کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔

"رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم سب میں اُجالا ہو گیا مولانا نے نظر بندی کا یہ زمانہ جس عزم 'استقلال 'استغنا اور قوتِ ایمان کے ساتھ بسر کیا وہ آئمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے لکھتے ہیں " میں سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈتا تھا بلکہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا"۔

۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو جب حکومتِ ہند نے مولانا آزاد کے نظر بندی کے احکام جاری کئے تو مولانا اس پر مسرور و شاداں ہوئے کہ انہیں تصنیف و تالیف کیلئے موقع ہاتھ آ جائے گا۔ ڈاکٹر انور

سجا"نیلی نوٹ بک" میں لکھتے ہیں کہ اگر حکومتِ پنجاب نے مجھے جیل نہ بھیجا ہوتا تو میں اتنی اچھی کتاب پڑھ پاتا اور نہ اس کا ترجمہ کر سکتا تھا۔ اس لئے نیلی نوٹ بک کیلئے میں حکومتِ پنجاب کا مشکور ہوں۔ آزادی کا یہ نیا مفہوم سارتر جمہوریہ سکوت میں بیان کرتا ہے "ہم کبھی اتنے آزاد نہیں تھے کہ جتنا جرمنوں کے تسلط کے دوران میں تھے ہمیں تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا ہمیں بات کرنے کا بھی حق میسّر نہیں تھا ہر روز ہماری توہین کی جاتی تھی اور ہمیں یہ سب چُپ چاپ سہنا پڑتا تھا ہمارے گروہ کے گروہ مزدوری' یہودیت یا سیاسی قید کے نام پر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ اشتہاروں' اخبارات اور اعلانات میں سینما کے پردے پر ہماری جو بے رنگ اور گھناؤنی تصویر دکھائی جاتی تھی ہمارے ستم گر یہ توقع رکھتے تھے کہ ہم اسے قبول کر لیں یہی وجہ ہے کہ ان حالات میں ہم آزاد تھے ہمارے افکار میں نازی زہر سرایت کر چکا تھا اس لئے ہم اپنے صحیح خیال ہی کو اپنی فتح مندی سے تعبیر کرتے تھے۔ طاقت ور پولیس ہمیں زبان بندی پر مجبور کرتی تھی اس لئے ہماری زبانوں سے نکلا ہوا ہر لفظ اصولوں کے اعلان کا درجہ رکھتا تھا ہمارا ہر وقت شکار کھیلا جاتا تھا اس لئے ہمارا ہر اشارہ سنجیدہ' ذمہ دارانہ وابستگی سے بہرہ ور تھا۔ دشمن کے ظلم وتشدّد نے ان غیر معمولی حالات میں ہمیں ایسے سوالات پوچھنے پر مجبور کر دیا جو آدمی کو عام حالات میں نہیں سُوجھا کرتے اسی طرح آزادی کا بنیادی سوال اٹھایا گیا تھا اور ہم اس گہرے علم سے بہرہ ور ہوئے جو کہ کسی آدمی کو اپنی ذات سے متعلق ارزانی ہو سکتا ہے یہ اس کی اپنی آزادی کی حدود ہیں"۔

اس طرح تشدّد کرنے والے ایک نئے انسان کو جنم دیتے ہیں سارتر کا یہ فلسفہ وجودیت کے نام سے آگے جا کر آزادی کا جو مفہوم دیتا ہے وہ نقّادوں کی نظر میں اور اپنی عملی شکل میں بہت مثبت نہیں ہے مگر یہ بات اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کہ جرمنوں کی قید نے ہی سارتر اور اس جیسے بہت سے انسانوں کو ان کے وجود اور اس وجود کی آزادی کی اہمیت کا احساس دلایا اُس وجود اور اُس آزادی کا جو انہیں اِس قید سے قبل نہیں تھا۔

......یہاں پر رک کر ایک بار پھر قدیم یونان پر ہماری نظر جاتی ہے کہ سقراط کے ذکر کے بغیر جیل میں آزادی اور آزادی میں سے موت کا تصوّر اُدھورا ہے۔ آزادی میں سے موت کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ یہ موت اور زہر کا پیالہ سقراط کا اپنا انتخاب تھا باوجود اس کے کہ وہ حالات سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے رومن آگورہ (ایتھنز کا وہ محلّہ جہاں سقراط رہتا تھا) کی ان گلیوں میں جانے اور انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں صبح سویرے یونان کا وہ بدصورت سنگ تراش جو دراصل اپنے باطن میں ایک علم اور دانش کا خوبصورت مجسمہ تھا' گھومتا اور پھرتا رہتا

تھا۔ سقراط اپنے آپ میں کھویا ہوا خیر و شر کی تلاش میں پھرتا رہتا تھا اور ایتھنز کے نوجوان اس کے پیچھے پیچھے اس امید پر چلتے تھے کہ کب اس کی پھٹی قبا سے دانش کا کوئی انمول موتی گرے اور وہ لپک کر اسے چُن لیں۔ ایتھنز کے نوجوان اس کے شیدائی تھے کیونکہ اس کی فکر سماج کے رجعت پسندوں کے بنائے ہوئے بُتوں سے نہ صرف ٹکراتی تھی بلکہ اپنی دلیل سے انہیں ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیتی تھی۔ ایتھنز کے اربابِ اختیار کو نوجوانوں کا سقراط سے یہ ربط و ضبط برداشت نہیں تھا ان کے بنائے ہوئے نظام کو جس نسل نے بڑھ کر تھامنا تھا ان کے حساب سے سقراط اس نسل کو اس نظام سے باغی کر رہا تھا۔ سقراط بُت پرستی کے خلاف تھا اور روایتی رسومِ عبادت ادا کرنے سے گریز کرتا تھا، جنسی بے راہ روی کے خلاف تھا۔ اب ذرا صورتِ حال کا جائزہ یوں لیجئے کہ اس دور کے حکّام، امیر طبقہ کو ناپسند کرتے تھے جبکہ سُقراط کی صحبت میں امیر طبقہ کے نوجوان بیٹھتے تھے جس سے حکمران طبقہ کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ یہ علمی اجتماع کسی عوامی انقلاب کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ ازل سے حکمران طبقہ کا جو خوف دانشوروں کو دار و رسن تک لے گیا وہ یہاں بھی موجود تھا لہٰذا سُقراط پر مقدمے قائم کئے گئے، یہ مقدمے بالکل ایسے تھے جیسے مارشل لاء دور میں سیاسی قیدیوں کیلئے تیار کئے جاتے ہیں جس میں فردِ جرم کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے جس میں ملزم کے دلائل اور اس کا وکیل فاضل، بلکہ فضول کردار ہوتے ہیں اور جس میں فیصلے پہلے سے تیار ہوتے ہیں۔ صرف ایک دکھاوے کی کارروائی کے بعد اپنا طے شدہ فیصلہ سنا دیا جاتا تھا لہٰذا سقراط کے تمام تر مدلّل اور پُرزور جوابات بے سُود تھے فیصلہ لکھا جا چکا تھا۔ سقراط نے جب محسوس کر لیا کہ اسے موت کی سزا یقینی دی جائے گی تو اس نے کہا۔

"میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ اگر تم میرے جیسے شخص کو جان سے مار دو گے تو تم مجھے اتنا ضرر نہیں پہنچا سکو گے جتنا اپنے آپ کو پہنچاؤ گے"۔

سقراط دراصل اپنے آپ کو بڑمکھی کہتا تھا۔ بقول علی عباس جلال پوری کے ہر معاشرے میں ایک بڑمکھی کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کو کاٹ کاٹ کر انہیں سوچنے پر مجبور کر دے۔

لیکن علی عباس جلالپوری نے اس بات پر غور کیوں نہیں کیا کہ لوگ بڑمکھی کے کاٹنے پر غور و فکر کرنے سے زیادہ اسے مار دینے پر زور دیتے ہیں اور یہی ان کیلئے آسان راستہ ہوتا ہے مگر سقراط وہ بڑمکھی تھا جس کی موت اس کی زندگی سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ پھر یہ ایک استعارتی موت بن گئی۔ سقراط کے الفاظ میں کسی شخص کو اختلافِ رائے یا تنقید کرنے کے جُرم میں قتل کر دینے سے کوئی سیاسی معاشرتی عُقدہ حل نہیں کیا جا سکتا، حکمرانوں کی سمجھ سے آج

تک بالاتر ہے لہٰذا وہ سیاسی قیدی کو زہر کا پیالہ یا پھانسی دینے سے قبل قید کے جس مرحلے سے گزارتے ہیں وہ تاریخ کا ایک نیا باب رقم کر جاتا ہے۔ تاریخ کا بھی اور سیاسی ادب کا بھی۔ میں یہاں سقراط کے الفاظ میں ذرا سی ترمیم کر رہی ہوں کہ حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کو قتل یا قید میں رکھ کر انہیں بات کرنے سے باز رکھ سکیں گے کہ وہ ان کی برائی پر ملامت نہ کریں تو یہ فرار کا راستہ ہے 'عزت کا راستہ نہیں۔ لہٰذا سزائے موت کے بعد خود سقراط نے اپنے شاگردوں کی تمام تر خواہش کے باوجود فرار کے بجائے عزت کی موت قبول کر لی 'اس کی یہ دلیل خوبصورت ہے کہ موت ایسی شے نہیں کہ جس سے دُور بھا گا جائے۔

امیرِ جماعتِ اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی پر ۵۳ء میں جب قادیانیوں کے خلاف پمفلٹ لکھنے کے جرم میں مجسٹریٹ نے موت کی سزا سناتے ہوئے کہا کہ آپ چاہیں تو اپیل کر سکتے ہیں جس پر مودودی صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا اور انہوں نے گرجدار اور باوقار لہجے میں کہا "مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے' زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی" اس کے بعد مودودی صاحب کو پھانسی پانے والوں کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے پھانسی پانے والے مجرموں کے کپڑے زیبِ تن کئے۔ نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر زمین پڑے ٹاٹ کے بستر پر لیٹ کر ایسے سوئے کہ رات بھر ان کے خراٹے سُن سُن کر پہردار حیرت میں ڈوبے رہے کہ یا اللہ عجیب شخص ہے جو پھانسی کا حکم پا کر ایسا مدہوش سویا کہ گویا اس کے سارے فکر و تردّد دور ہو گئے۔ مودودی صاحب اپنے فعل و عمل سے مطمئن تھے ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اس لئے موت کی منزل کوئی مشکل منزل نہیں لگی' یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد عوامی دباؤ کے تحت خود حکومت کو ان کے خلاف اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور موت کی سزا کو قید کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔

مودودی صاحب کی اس کیفیت کو فیضؔ کے ان اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے ؎

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے' نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گِلا نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

سقراط کے زہر پینے سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی تاریخ تک ایسی کتنی شرمناک مثالیں ہیں کہ حکمرانوں نے اپنے اقتدار کی "ہیبت" کا خود شکار ہو کر (طاقت کا نہیں) کسی محض اچھے انسان کو بہت اعلیٰ ہستی بنا دیا بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی میں شرمناک ترین پہلو یہ ہے کہ یہ فعل جرأت کے ساتھ بھی نہیں کیا جا سکا اس کا اعلان اسے ایک درست فیصلہ بنانے میں مدد دیتا مگر جو فیصلہ اپنی ابتداء میں ہی غلط تھا اس کو درست بنانے کی ساری کوششیں یوں رائیگاں گئیں کہ "فیصلہ کرنے والا" اپنے "حلقۂ انتخاب" سمیت اپنے "قادرِ مطلق" کے فیصلے کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو بھی ملک سے فرار ہو سکتے تھے اور سقراط بھی زہر پینے سے بچ سکتا تھا مگر دونوں نے موت کو اور بالآخر موت کو ہی قبول کیا دونوں جانتے تھے کہ وہ تاریخ کا استعارہ بن جائیں گے چاہے ان کے فلسفے' ان کی سیاست اور ان کے فیصلوں میں بہت کچھ غلط تھا یہ شاندار موت سارے داغ دھو دے گی گویا سقراط کا کہنا درست تھا کہ اسے مارنے والے زیادہ نقصان میں رہیں گے لہٰذا ذوالفقار علی بھٹو کو مارنے والے بھی بہت نقصان میں رہے۔

امریکن ناولسٹ جیک لنڈن نے کہا ہے "مجھے سچ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لینے دو مجھے بتاؤ سچ کا چہرہ کیسا ہوتا ہے"۔

میں نے بھی کوشش کی ہے کہ آپ کو سچ دکھا سکوں اگرچہ یہ مشکل کام ہے کیونکہ سچ دکھانے والے کو ہر تعصّب سے یا ترغیب سے پاک ہونا پڑتا ہے مجھے اپنے سچ پر ناز ہو سکتا ہے مگر میرے اندر کتنی خامیاں اور بشری کمزوریاں ہیں جن کا خوف بھی دامن گیر ہے کہ کہیں میرا جھکاؤ کسی خاص سمت نہ ہو جائے' میری کوشش تو یہ ہے کہ میں اپنے عوام کے ساتھ چلوں اس لئے میں یہاں ان لوگوں کا ذکر کر رہی ہوں جو عوام کے ساتھ چلے' چاہے وہ غلط فیصلوں کے مرتکب بھی ہوئے جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنی کتاب "اگر مجھے قتل کیا گیا" میں لکھتے ہیں۔ "ایک نظام وہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ نمائندہ حکومت قائم کرتے ہیں دوسرا نظام وہ ہوتا ہے کہ ملک میں صرف ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اور حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن دونوں صورتوں میں مسلح افواج شہری حکومت کے تابع ہوتی ہیں اور اسی کے حکم و ہدایت کے مطابق عمل کرتی ہیں اگر ایک ملک کی وحدت اور خود مختاری عوام اور ان کے منتخب نمائندوں کے اعلیٰ ہاتھوں میں محفوظ نہیں تو پھر یہ دوسرے ہاتھوں میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی یہ عوام اور ان کی حب الوطنی کی توہین ہے کہ غیر منتخب تنخواہ یافتہ چوکیداروں کو قومی اتحاد و وحدت کا

علمبردار بنادیا جائے یہ قومی وحدت کی موت کا ماتمی نغمہ ہو گا"۔

بھٹو جہاں جہاں عوام کے ساتھ رہا وہ جسمانی طور پر مر کر بھی زندہ تھا اس نے عدالت میں جو تقریریں کیں اور جیل میں جو تحریریں لکھیں ان میں جہاں جہاں وہ عوام کے ساتھ نظر آیا ان کی بات کرتا ہوا دکھائی دیا مضبوط اور مستحکم رہا اور یہی چیز اس کی موت کو قریب ترلاتی رہی مگر اپنی پیاری بیٹی کے نام خطوط میں وہ خود تو کہیں خود پسند نہیں ہوا مگر اس نے اپنی بیٹی کو خود پسند ہونے میں مدد ضرور دی۔ بے نظیر بھٹو نے جتنی طویل جیلیں کاٹیں اور جو جو اذیتیں برداشت کیں وہ دنیا میں کسی خاتون پارٹی لیڈر نے کم ہی کی ہوں گی مگر ۸۸ء میں اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے عوام سے اپنا رشتہ توڑ لیا جن کی خاطر وہ اپنی جوانی کے بہترین دن جیل کی کوٹھڑیوں میں گزارتی رہی ہیں عوام سے جب وہ فاصلے پر ہو کر ملیں تو اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھیں، وہ خلاء جو ان کے اور عوام کے درمیان آیا اس خلاء پر ایک بار پھر شب خون مارنے والوں نے قبضہ کر لیا اور محترمہ کو منظر سے ہٹانے میں اتنے بھی دن نہیں لگے جتنے دن ان کے والد کو مارنے میں لگے تھے یہ ہوتی ہے عوامی طاقت اور اس پر انحصار کرنے یا نہ کرنے کی کوشش کا نتیجہ۔

میں نے ابھی امریکن ناولسٹ جیک لنڈن کا ذکر کیا تھا جیک لنڈن نے برسوں ایک مکان تعمیر کرنے کا خواب دیکھا تھا جب وہ مکان عین تکمیل کے بعد نامعلوم طور پر آگ سے جل کر راکھ ہو گیا تو اپنے عمر بھر کے خواب کی راکھ کے سامنے کھڑے ہو کر جیک لنڈن نے صرف یہ لفظ کہے "میں وہی شخص ہونا چاہوں گا جس کا گھر جلایا گیا وہ نہیں جس نے جلایا"۔ گھروں کی آگ، جیلوں کی تاریکیاں اور قید و بند کی صعُوبتیں ایسے ہی لوگوں کا مقدّر ہوتی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے سچ کے چہرے کی جھلک دکھاؤ جب سچ کے چہرے سامنے آتے ہیں تو اٹلی کے انقلابی انتونیو گرامچی کا چہرہ بہت اُجلا اور شفّاف نظر آتا ہے جس کے بیمار بدن کے اندر موجود، حکمرانوں کے ایوانِ اقتدار کو لرزا دینے والا ذہن اتنا طاقتور تھا کہ بالآخر اسے جیل میں قید کر دیا گیا اس بیمار کُب زدہ جسم کو جس کیلئے اٹلی کی سرد ہَوا کے جھونکے زہر تھے اس نے جیل کی چار دیواری میں بیٹھ کر خود کو ذہن کی دنیا کا اسپارٹیکس ثابت کیا جب یہ صورت ہو تو پھر بقول ظہیر کاشمیری۔

کھُل گئے پھر لبِ منصور انا الحق کیلئے
پھر چلے آتے ہیں وحشی رسن و دار کے ساتھ

انتونو گرامچی اٹلی کے جنوبی خطے میں پیدا ہوا تھا گرامچی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جن حالات میں پروان چڑھا وہ اٹلی کا کمرتوڑ معاشی بحران کا دور تھا ساڑھے سات سال کی عمر سے جب

گرامچی نے الفاظ کے معنی اور پھر ان معنوں کے اصل مطلب سمجھنا شروع کیے تو وہ سچ کو جاننے کے اس عجیب وغریب سفر پر روانہ ہو گیا جس میں اس کا ٹکراؤ بار بار فاشسٹ قوّتوں سے ہوا۔بیس سال کی عمر میں روس کے انقلاب سے چھ سال قبل نو آبادیاتی نظام اور محکوم عوام کے بارے میں اس نے اپنے مضمون میں لکھا تھا۔ ''جنگیں تجارت کیلئے لڑی جاتی ہیں تہذیب کیلئے نہیں، جب چینیوں نے انگریزوں کی افیم خریدنے سے انکار کر دیا تھا تو انگریزوں نے چین کے کتنے شہروں کو تاراج کر دیا تھا؟ اسے کہتے ہیں تہذیب؟ روسیوں اور جاپانیوں نے کوریا اور منچوریا کی تجارت پر قبضہ کرنے کیلئے ہی ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہایا تھا''۔

۸ نومبر ۲۶ء کو مسولینی کی فاشسٹ پولیس نے گرامچی کو گرفتار کر لیا، گرامچی کو شہید بننے اور قید وبند کی صعُوبتیں برداشت کرنے کا قطعی شوق نہیں تھا اس نے اپنی بیوی جولیا کی بہن کے نام ایک خط میں لکھا۔

''مجموعی طور پر تم مجھے ایک ایسے شخص کے روپ میں دیکھتی ہو جو اذیّت سہنے 'شہید بننے کے حق پر مصر ہو' تم مجھے ایک اور گاندھی سمجھتی ہو جو دنیا کے سامنے ہندوستانی عوام کے دکھوں کا شاہد ہے''۔

اس کے بعد وہ اپنی ماں کی فکر و پریشانی دور کرنے کیلئے لکھتا ہے۔

''ہمارے درمیان احساس کی ایک پوری دنیا اور ایک پورا طرزِ فکر کھائی کی مانند حائل ہے جبکہ میرے لئے یہ اس سیاسی جِدّوجُہد کا ایک وقوعہ ہے جو جاری ہے اور جو نہ صرف اٹلی میں بلکہ ساری دنیا میں جاری رہے گی اس لئے یہ ایک ناگفتہ بہ سانحہ ہے جس کے پیچیدہ اسباب واثرات اس کی سمجھ سے باہر ہیں، میں پکڑا گیا بالکل اسی طرح جس طرح جنگ کے دوران کوئی قیدی پکڑ لیا جاتا ہے جسے یہ علم ہوتا ہے کہ ایسی بات ہو سکتی تھی اور یہ بھی کہ اس سے بھی بدتر بات پیش آ سکتی ہے''۔

گرامچی کی صحت بہت خراب تھی اور جیل میں اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی پھر بھی اسے دور دراز جیل بھیجا جاتا تھا اور اس کے باوجود وہ صرف کتابیں اور کاغذ و قلم کی فرمائش کرتا تھا۔ اقبال اختر کے الفاظ میں...... ''گرامچی کیلئے روزانہ دو تین گھنٹے لکھنا معمول بن گیا' جیل کے نامساعد حالات' تیزی سے روبہ انحطاط صحت اور جولیا (بیوی) کی طویل خاموشیوں کے وقفوں سے لاحق ہونے والی ذہنی کوفت کے باوجود گرامچی روزانہ مہینے در مہینے' سال در سال لکھتا رہا۔ اس طریقے سے گرامچی نے اپنی انقلابی جِدّوجُہد کو جاری رکھا اور دنیا سے' انسانی سماج سے اپنے رابطہ کو

باقی رکھا۔ گرامچی نے اس حالت میں بھی جبکہ اس کے جسمانی قویٰ جواب دے رہے تھے مطالعہ اور لکھنے کا کام جاری رکھا اپنے قیام کے دوران اس نے پانچ نوٹ بُکس توری جیل میں اور گیارہ نوٹ بُکس فورمیا جیل میں مقیّدرہ کر پوری کیں۔

جس صبح سات بجے گرامچی کو رہا ہونا تھا اسی صبح چار بجے اس کا جیل میں انتقال ہو گیا اپنی ماں کے نام اپنے آخری خط میں اس نے لکھا تھا۔ ......

"تم اس پر ہراساں یا رنجیدہ مت ہو یہ سمجھ لو کہ میں ایک سیاسی قیدی ہوں اس میں قطعی ایسی کوئی بات نہیں جس پر شرمندہ ہوا جائے میں اپنے خیالات بدلنے کو تیار نہیں بلاشبہ میں نہ صرف ان کیلئے جیل جانے بلکہ جان دینے تک کیلئے آمادہ ہوں"۔

برِ صغیر کی عدالت جس میں انگریز منصف تھے (اگرچہ مجرم تھے) مولانا آزاد کے یہ الفاظ بہت یادگار ہیں یہ الفاظ مجھے بلغاریہ کے ڈیمتروف کے جھوٹے مقدمہ پر یاد آئے ہیں جس میں اس کے خلاف گواہی دینے والوں میں گوئبلز بھی شامل تھا۔ ...... آزاد کہتے ہیں۔

"تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی دونوں کیلئے استعمال کی جا سکتی ہے منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل و حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مُستبدّ حکومتوں کیلئے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدّس بانیانِ مذہب سے لے کر سائنس کے محقّقین اور مُنکشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی ہم اس میں مسیح جیسے پاک انسان کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیئے گئے ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا ہم کو اسمیں فلورنس کے صداکارِ حقیقت گالیلو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات اور مشاہدات کو اس لئے نہ جھٹلا سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم ہے"۔

ڈیمتروف جسے ۱۹۱۷ء میں گرفتار کیا گیا اس کا جرم تو جو تھا سو تھا لیکن اس کی گرفتاری کی داستان بھی

دلچسپی سے خالی نہیں۔ ڈیمتروف ریل میں سفر کر رہا تھا جس میں اس کے ساتھ ایک کرنل بھی موجود تھا دورانِ سفر محاذِ جنگ سے واپس آنے والا ایک زخمی سپاہی ڈبے میں آ گیا۔ کرنل نے اسے ڈانٹ کر ڈبے سے باہر نکال دیا۔ ڈیمتروف نے سپاہی کی حمایت کی جس پر اس کی کرنل سے تلخ کلامی ہوئی۔ اب ڈیمتروف کی گرفتاری ناگزیر تھی لہٰذا کرنل کے حکم پر ڈیمتروف کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اس کا جرم یہ رقم کیا گیا کہ اس نے ایک فوجی سپاہی کو افسر کے خلاف بغاوت پر ابھارا ہے۔ عدالت نے جب اسے تین سال قیدِ تنہائی کی سزا سنائی تو اس نے قید کے دوران جرمن زبان سیکھی۔ اس نے لینن کی کتاب "ریاست اور انقلاب" کا مطالعہ کیا اور بعد میں اس کتاب کا بلغاریائی زبان میں ترجمہ کیا۔ قید خانے سے اس نے ملک کے سیاسی حالات پر نظر رکھی اور عوام کی رہنمائی کرتا رہا اور اس کی قید ہی محنت کشوں کی اور سپاہیوں کی بغاوت کا پیش خیمہ بنی۔ حکومت کو عوامی مطالبہ پر ڈیمتروف کو رہا کرنا پڑا باہر آنے کے بعد اس کی طاقت میں جتنا اضافہ ہو چکا تھا وہ بعد میں اس کی جدّوجُہد کا سرمایہ اور اسلحہ بنا اور یہ ساری طاقت اسے جیل اور قید نے مہیّا کی تھی یہ ساری صورتِ حال کسی لطیفے سے کم نہیں لگتی کہ جیل کسی مجرم کو جرُم میں طاق اور سیاسی قیدی کو سیاست میں مزید بے باک کرنے میں کتنی معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہے لیکن ان جیلوں کے اندر ایک اور سیل بھی ہے جو ٹارچر سیل کہلاتا ہے جس کی سب سے پہلی جھلک میں نے آپ کو کوہ قاف کی چوٹی پر بندھے ہوئے پرومی تھیئس کی صورت میں دکھائی تھی پرومی تھیئس کا مکالمہ جو اس نے پریوں کے کورس سے کیا سارے کا سارا نسلِ انسانی کی بھلائی کیلئے کیا تھا وہ تمام لوگ جو پرومی تھیئس کے بعد قید اور اذیّت گاہوں میں گئے۔ انسان اور عوام کی بھلائی کے جرُم میں اذیّتیں سہتے رہے۔ یہاں میں جام ساقی کے مکالمے نقل کر رہی ہوں جو انہوں نے ایک مقدمہ کے دوران عدالت کو مخاطب کر کے کہے ...... جام ساقی کہتے ہیں۔

"آج کل ہمارے ملک میں پندرہ تا تیس ہزار سیاسی قیدی ہیں اور ان سب کا جرُم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں ایک انگریزی پرک کا مقولہ ہے کہ جتنا کسی ملک کے لوگ آزاد ہوں گے اتنا ہی وہ ملک آزاد ہو گا اس لئے ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس گھٹن کی وجہ امریکہ کی ماتحتی ہے"۔

آگے چل کر جام ساقی نے کہا۔

"مجھے حیدر آباد کی خصوصی فوجی عدالت سے سرکاری طور پر دس سال کی سزا اکتوبر ۸۱ء کو سنائی گئی فوجی قوانین کے مطابق جب تک یہ فیصلہ ملزم کو نہیں سنایا جاتا اس وقت تک اسے راز سمجھا

جاتا ہے اس کا علم صرف متعلقہ افراد کو ہی ہوتا ہے لیکن بی بی سی نے اس دس سال کی سزا کا اعلان مارچ ۱۹۸۱ء میں ہی کر دیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ واشنگٹن میں دیا گیا"۔

جام ساقی نے بہت کچھ کہا جو لکھا اور چھاپا جا چکا ہے ان خفیہ اذیّت گاہوں کے بارے میں جہاں حسن ناصر، اور نذیر عباسی، سید کامران رضا، صحافی اشفاق حسین قریشی اور مقبول بٹ جیسے لوگوں کو اذیّتیں دے دے کر شہید کیا گیا ان اذیت پانے والوں کی تعداد تو بہت طویل ہے جن کے ذکر سے اپنی انگلیوں سے لہو ٹپکنے لگتا ہے۔ ...... ایک پنجابی گیت کے بول ہیں۔

گڈی سرکاری مُلاں توں لنگھنی آچھم کر کے
بچھڑے ماواں دے رُکھنی وبندی آبند کر کے

لیکن جب بھی کسی نے قید کے راستوں پر قدم رکھا اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کے پھُول ضرور نظر آئے۔ فیضؔ کے ایک مجموعے میں یہ مکالمہ درج ہے جو انہوں نے ایک روسی ادیب سے ماسکو میں کیا وہ ۵۸ء کا دور تھا۔

روسی ادیب نے جب پوچھا مستقبل میں آپ کا کیا پروگرام ہے تو فیض نے جواب میں ذکر کیا کہ وہ لندن ہوتے ہوئے پاکستان اپنے وطن جانا چاہتے ہیں۔

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں............"

"ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہئے"۔

"تو پھر جیل یقینی ہے............"

"شاید...... اور کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہئے"۔

لیکن اگر...... جیل سے بھی بد تر کچھ ہو تو......؟

"اگر جیل سے بھی بد تر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً بُرا ہو گا لیکن تم جانتے ہو جِدّوجُہد بہر حال جِدّوجُہد ہے"۔

پھر فیضؔ کو جیل جانا پڑا...... جیل سے بھی برا فیضؔ اور فیضؔ کے ساتھیوں کیلئے تو نہ ہو سکا البتہ حکمرانوں کیلئے ضرور بُرا ہوا کہ "زندان نامہ" ہو گیا۔

گڑھی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لئے

اور......

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل توہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رُخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

غرض ایک دو نہیں پورا زندان نامہ ملک اور ملک کے باہر ہنگامہ مچا گیا حکمران اپنا سر پیٹنے کے علاوہ اگر کچھ اور کر سکتے تھے تو انہیں وہ بھی کر لینا چاہئے تھا ادھر فیض تھے کہ کہتے رہے۔

ان اسیروں کے نام

جن کے سپنوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

بات کرتے کرتے میں بار بار تاریخ کے ادوار کی ترتیب کا خیال بھول جاتی ہوں جس کیلئے آپ مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مولانا آزاد نے جس مقصد کیلئے قید و بند کی صعُوبتیں اٹھائیں وہ آزادی تھا۔ آزادی کی جنگ اس وقت ہر مکتبِ فکر کی طرف سے لڑی جا رہی تھی اور عوام کے اندر ایک ہی تڑپ تھی آزادی' آزادی اور آزادی...... محکوم اقوام کی صف سے نکل کر آزاد اقوام کی صف میں شامل ہونے کی تڑپ نے اس وقت ہر ہندوستانی کو بے چین کر رکھا تھا، آزادی کے اس تاج محل کے کتنے معمار ایسے ہیں جن کے نام بھی ہم نہیں جانتے، ہم ان ایک ایک چہروں کو نہیں پہچانتے جو جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کے حکم سے گولیوں پر رکھ لئے گئے، وہ عصمتیں جو تار تار ہوئیں، وہ لہو جو بہتے رہے جمتے رہے اور منزل کا نشان بنتے رہے' اسی میں ایک نام بھگت سنگھ کا ہے۔ بھگت سنگھ کے بارے میں لکھنے سے پہلے مجھے دُلّا بھٹی کا واقعہ یاد آ رہا ہے جس نے شہنشاہ اکبر سے ٹکّر لی اور پھانسی چڑھ گیا۔ اسے پھانسی دینا اکبر کی مجبوری تھی کہ اگر وہ اسے محض قید میں رکھتا تو مغل تاریخ کا نقشہ آج وقت سے پہلے ہی کچھ اور ہوتا لیکن اس کے ایک ساتھی شاہ حسین جس کو اکبر کسی الزام

میں گرفتار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک صوفی منش شاعر تھا اس کا بندوبست اکبر نے یوں کیا کہ اپنا ایک ہرکارہ اس کے پیچھے لگا دیا جو شاہ حسین کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ نوٹ کر کے اکبر تک پہنچاتا تھا کہ شاید کہیں کوئی کام کی بات پتہ چل جائے۔ اکبر کے اس فعل نے پنجاب کی لوک شاعری پر بہت بڑا احسان کیا یوں کہ شاہ حسین کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ رقم ہوتا گیا اپنے وسیع تر معنی رکھنے والی شاعری کی یہ لائنیں بھی۔

رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی

اسی ہندوستان نے بھگت سنگھ کو جنم دیا۔ جس کی پیدائش سے چند روز قبل اس کے باپ کو پنجاب کی کسان تحریک کے سلسلے میں جیل سے رہائی کا تار ملا تھا۔ سردار کشن سنگھ کا بیٹا بھگت سنگھ تین سال کی عمر سے اپنے وطن کی آزادی کی باتیں کرتا تھا جس وقت بھگت سنگھ کی عمر نو برس تھی اس وقت پندرہ سالہ کرتار سنگھ سرابھا کو بھی پھانسی دی گئی۔ بھگت سنگھ پر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا تھا وہ کرتار سنگھ سرابھا کی تصویر اپنے پاس رکھ کر یہ شعر گنگناتا تھا۔

سیوا دیس دی جندڑیے بڑی اوکھی
گلاں کرنیاں ڈھیر سُکھلّیاں نیں
جنہاں دیس سیوا وچ پیر پایا
اونہاں لکھ مصیبتاں جھلیاں نیں

بہت نو عمری میں آزادی اور انقلاب کا جو خواب لیکر بھگت سنگھ پروان چڑھا وہ سانڈرس کے قتل اور اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد گرفتاری اور مقدمے پر جا کر ٹھہرا پورے مقدمے کے دوران بھگت سنگھ نے اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ اسے موت کی سزا دی جائے گی تو اس کے والد نے اسپیشل ٹریبونل کو درخواست بھیجی جس میں یہ ثابت کرنے کیلئے شہادت پیش کرنے کی اجازت چاہی کہ بھگت سنگھ سانڈرس کے قتل والے دن لاہور سے باہر تھے۔ جب بھگت سنگھ کو پتہ چلا تو وہ غصے اور دُکھ سے اُبل پڑا۔ پرومی مھتیس سے جو داستان میں نے شروع کی ہے اس کا ہر باغی رحم کی درخواست پر بھڑک جاتا ہے۔ بھگت سنگھ نے اپنے والد کو جو خط لکھا اس میں یہ بات واضح کر دی کہ...... "یہ بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے کہ میری صفائی پیش کرنے کے سلسلے میں آپ نے اسپیشل ٹریبونل کے ممبروں کو ایک درخواست بھجوائی ہے اس قسم کی چوٹ اتنی سخت ہے کہ جسے خاموشی سے برداشت نہیں کیا جا سکتا........... میں نے ہمیشہ نہ تو

بَرّی ہونے کے بارے میں سوچا ہے اور نہ ہی کبھی اس کی امید ظاہر کی ہے یہ ایک نظریئے اور پالیسی کا سوال ہے میرے پاس اس کیلئے دلائل موجود ہیں لیکن اس وقت دلیل بازی کی ضرورت نہیں.......... میرے اصولوں کے سامنے میری زندگی کی کوئی قیمت نہیں کم از کم میرے لئے تو بالکل نہیں "۔

اس کے بعد گاندھی نے اپنے کانگریسی لڑکے تو آزاد کرالئے مگر سوشلسٹ رحجان رکھنے والوں کے معاملے کو سمجھوتے کی نذر کر دیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت ہو گئی۔ اسی لاہور میں انہیں پھانسی پر چڑھایا گیا بھگت سنگھ نے لاہور جیل میں جو خط لکھے وہ انقلابی تحریروں میں گراں قدر اضافہ ہیں خوبصورت موت کے حوالے سے بھگت سنگھ نے لکھا تھا۔

"جب یہ سزا سنائی جائے گی اور اس کے بعد پھانسی دی جائے گی یہ موت بھی خوبصورت ہو گی لیکن خودکشی کرنا صرف چند مصیبتوں سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو مار دینا تو بزدلی ہے، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مصیبتیں انسان کو مکمل بناتی ہیں"۔

بھگت سنگھ کی مندرجہ ذیل تحریر میرے اس نظریئے سے بہت قریب ہے جس کے تحت میں نے یہ تحریر لکھی کہ جیل ایک جسمانی قید اور روحانی آزادی کی درس گاہ بھی بن سکتی ہے۔ ..... بھگت سنگھ نے لکھا ہے۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جیل میں اور صرف جیل میں ہی کسی شخص کو جرُم اور گناہ جیسے اہم سماجی مسئلے کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس موضوع پر میں نے کتابیں پڑھیں اور جیل ہی ایسے موضوع کا مطالعہ کرنے کیلئے موزوں جگہ ہے۔ مطالعہ کا بہتر حصّہ خود مصیبتیں سہنا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو کہ روس میں قیدیوں کو جیلوں میں مصیبتیں جھیلنا ہی انقلاب پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب بنا۔

اگر تم سمجھتے ہو کہ جیل کی زندگی دراصل ذلیل کرتی ہے تو اس کے خلاف جِدّوجُہد کر کے اسے بہتر بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

ہم جیل کے قواعد کے مطابق بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے کام کرتے رہے، ہمیں ہر طرح سے مخالفت کا نشانہ بنایا جاتا تھا جو لوگ اپنے آپ کو بڑے انقلابی سمجھتے تھے وہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے کیا وہ حالات حد درجہ آزمائش بھرے نہیں تھے؟ اپنی تحریک اور جِدّوجُہد کو جاری رکھنے کیلئے ہمارے پاس کیا وجوہات تھیں کیا ایسے انقلابی کارکنوں کی مثالیں موجود نہیں جو جیلوں سے سزا کاٹ کر آئے ہیں اور اب بھی کام کر رہے ہیں.......... انسان کو اپنے اصولوں پر

مضبوطی سے ڈٹے رہنے کی کوشش کرنی چاہئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد کیا پیش آئے گا۔"

اپنے ساتھیوں کی جیل سے رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ خود جیلوں کے حوالے سے بھگت سنگھ نے انسپکٹر جنرل جیل پنجاب، سپرنٹنڈنٹ جیل لاہور، حکومتِ ہند اور بے شمار تنظیموں کے نام جو خط لکھے وہ سیاسی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں یہ بھگت سنگھ کی تحریریں تھیں جو جیل کی کال کوٹھڑی سے لکھی گئیں بالکل ایسے جیسے غبارِ خاطر میں مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غبارِ خاطر میں مولانا جیل کے تجربے کے حوالے سے لکھتے ہیں "تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کیلئے جدّوجُہد کرنی پڑے گی جدّوجُہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھُلنے لگتا ہے"۔

مولانا کے ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ ہر سیاسی قیدی جیل میں چُومکھی لڑائی لڑتا ہے اسے باہر بیٹھے کارکنوں اور ساتھیوں سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے اسے جیل کے حکام کا سامنا ہوتا ہے پھر اپنے اندر جو تبدیلیاں آتی ہیں اس سے بھی ایک جنگ لڑنی پڑتی ہے، بہت سے اچھے اچھے لوگوں نے جیل میں خود کو ہشاش بشاش رکھا باہر آنے کے بعد دلچسپ ڈائریاں تحریر کیں جن سے بعض اوقات جیل کا تصور بڑا رومانٹک بھی اُبھرا مگر مولانا آزاد صاف گوئی سے بیان کرتے ہیں۔

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھُپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے تھے"۔

اس کے بعد مولانا نے طویل انداز میں اپنے معمولات کو کیفیات کے ساتھ ملا کر بیان کیا اور انہوں نے بھی ان الفاظ میں کہ "میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا" بھگت سنگھ والی کیفیت کا اظہار کیا اور پھر اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھُپ جاتی ہو،

جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں ہر دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح وشام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سروسامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا، ساری مصیبت یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گُم ہو جاتا ہے ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈیں گے حالانکہ اگر اسے ڈھونڈ نکالیں تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی کے اندر سمٹا ہوا مل جائے"۔

یہ تھا وہ خزانہ جوار دو ادب کو ہندوستان میں آزاد نے تحریکِ آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے دیا۔ زندگی کا کوئی گوشہ انہوں نے خالی نہ چھوڑا، پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ جیسے مندرجہ بالا الفاظ میں آزاد نے اپنی جیل کی صورتِ حال سے زیادہ آج کے معاشرے کی تصویر کھینچی ہے۔

یہ بات کہ ساری مصیبت یہ ہے کہ ہمارا دل ودماغ ہی کہیں گُم ہو جاتا ہے سماج میں ایک مِس فِٹ شخص کی کیفیت کی عکاس ہے، سب کچھ تو ہے اس دنیا میں ہمارے ارد گرد مگر ہمیں ایک کمی اور خلاء کا احساس کیوں رہتا ہے، کیا واقعی اس لئے کہ ہم باہر سب کچھ ڈھونڈتے ہیں اور اپنے اندر کچھ تلاش نہیں کرتے، تاروں کی چمک، سورج کی حرارت، چاند کی ٹھنڈک، دھنک کے رنگ، صبح کی تازگی، شام کی سرمئی یہ سب ہمارے اندر ہے۔ آزاد نے جیل کے اندر بیٹھ کر اپنے کھوئے ہوئے دل، کو تلاش کیا۔ بھگت سنگھ نے اپنے اندر کے سارے جذبوں کو جیل سے باہر ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ گرامچی جیل کی دس سال طویل رات میں باہر کی دنیا سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکا، یہ سب اس نظام کی کتنی بڑی شکست ہے جس نے جیلوں کو جنم دیا۔ جب یونانی، ترکوں کے خلاف اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے تو یونانی ادیب کازان فزاکس نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ رقم کیا جب وہ دس سال کا تھا، ایک صبح اس کا باپ اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر لے گیا جہاں گاؤں کے ساتھ درختوں پر تین لاشیں لٹک رہی تھیں یہ ان جیالوں کی لاشیں تھیں جنہیں آزادی کی جنگ لڑنے کے جُرم میں پھانسی دے کر لوگوں کو عبرت دینے کیلئے سرِعام لٹکا دیا گیا تھا۔ کازان فزاکس سہم گیا تو اس کے باپ نے اسے ان لاشوں کے پیر چُومنے کو کہا وہ ڈرتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے ان لاشوں کے پیر چھوئے اور پھر چُوم لئے تو اس کا سارا ڈر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اس روز اسے معلوم ہوا کہ موت کتنی چھوٹی چیز ہوتی ہے اور آزادی کتنی بڑی ہوتی ہے یہاں آکر

آمریّت کے سارے نفسیاتی حربے بے کار ہو جاتے ہیں۔ لٹکی ہوئی لاشوں کے ذریعے لوگوں کا موت سے خوف ختم کر دیتے ہیں۔ جیلوں کے ذریعے دماغوں کو اسپارٹیکس بنا دیتے ہیں ادب پارے اور انقلاب پارے تحریر ہوتے ہیں۔ جب تذلیل کے ذریعے سارتر جیسے لوگ وجودیت کا فلسفہ آگے بڑھاتے ہیں اور آزادی کے مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔ چلّی کے لوک فن کار وکٹرہارا کی بیوی جون ہارا نے بڑی مشکل سے اپنے شوہر کی قید اور پھر موت کی صورتِ حال کو اس کے ساتھیوں کی مدد سے جمع کیا تھا۔ چلّی کے اسٹیڈیم میں جو لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور جسے چاروں طرف سے فوج نے گھیر رکھا تھا۔ وکٹرہارا اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا اس نے جلدی سے چند سطریں ایک گیت کی گھسیٹیں وہ دنیا کو بتا دینے کیلئے ان ہولناکیوں کو ریکارڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پُرتشدّد مناظر کے باوجود وہ مستقبل اور زندگی کی طرف سے پُرامید تھا جُونہی وہ آخری مصرعوں تک پہنچا جس کیلئے اس نے اپنے ذہن میں موسیقی ترتیب دے رکھی تھی، مسلح فوجی اسے لینے آ گئے پھر جیل............ قید............ اور تشدّد............ ایک طویل داستان تھی جس کا ایک حصّہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک موقع پر سب کے سامنے وکٹرہارا کو گالیاں دیں اور مارا پیٹا گیا اور کہا گیا۔

"اب گاؤ..... اگر تم گا سکتے ہو، حرام زادے۔

اور دُکھ درد کے ان چار دنوں کے بعد اسٹیڈیم میں وکٹر کی آواز بلند ہوئی وہ پاپولر یونٹی کا گیت گا رہا تھا اُسے بُری طرح مارا گیا اور وہ اُسے اس کی اذیّت کے اُس آخری دور تک لے گئے جہاں ایک ماہی گیر بستی میں اس کی لاش پہچان کر ایک عورت چیخ پڑی "یہ وکٹرہارا ہے"............ یوں ظلم کا ایک باب بند ہوا اور تاریخ کا ایک باب رقم ہوا دورِ حاضر میں نیلسن منڈیلا ایسی سحر انگیز شخصیت ہے جو ۲۸ سال قید تنہائی میں رہے یہاں تک کہ جنوبی افریقہ کے عوام انہیں پہچانتے نہیں تھے۔ دورِ حاضر کا یہ واقعہ سب سے حیرت انگیز ہے کہ جو شخص جیل کے اندر سے اپنے ملک کے عوام کے دلوں پر حکومت کرتا رہا عوام اس کی شکل سے واقف نہیں تھے۔ راشد چودھری کے الفاظ میں "منڈیلا کروڑوں عوام کے نجات دہندہ اور غیر متنازعہ شخصیت رہے ہیں یہ وہ پُراسرار شخصیت ہیں جس نے جیل کوٹھڑیوں سے اپنے ہم وطنوں کے دل پر حکومت کی، جدّوجُہدِ آزادی کو جاری رکھا اور بالآخر غیر معمولی عزم واستقامت کے بل بوتے پر انھوں نے سامراج کے خلاف پہلی اور زبردست کامیابی حاصل کی اور جنوبی افریقہ کی حکومت نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر انہیں رہا کر دیا تاکہ وہ صدیوں سے جبر واستبداد کی چکّی میں پسنے والے ہم وطنوں کے مستقبل کے فیصلے میں شریک ہوں "۔

بلاشبہ نیلسن منڈیلا اپنی پُراسراریت اور پامردی واستقلال کے طلسم کی وجہ سے دنیا کے موجود سیاسی رہنماؤں میں منفرد اور سب سے طاقتور قائد ہیں۔

آرچ بشپ ڈیسمونڈ ٹوٹو کے الفاظ ہیں۔

"منڈیلا قوم کی علامت ہیں ان کی قیدِ تنہائی ہم وطنوں کو اُس ظلم وتشدّد کی یاد دلاتی ہے جو خود ان پر ہوا۔ منڈیلا کی داستانِ ایثار وقربانی دراصل سیاہ فاموں کے خلاف جبر واستبداد کے مظاہرے کے خلاف مزاحمت تھی اور ان کی رہائی آزادی کے اس تصور کی جھلک ہے جس کیلئے ان کی قوم طویل عرصے سے آرزو کر رہی ہے"۔

منڈیلا نے اپنے ساتھی ٹامبو کے ساتھ مل کر افریقن نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب افریقن حکومت برسرِاقتدار آئی تو اس نے اپنی نسل پرستانہ کارروائیوں کے باعث حالات کو زیادہ خراب کر دیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو پولیس نے شارپ وے میں سیاہ فام احتجاجی مظاہرین پر حملہ کیا۔ جس کے باعث ۶۹ حرّیت پسند شہید ہو گئے جس کے بعد حالات تبدیل ہوتے ہوتے منڈیلا کی گوریلا سرگرمیوں تک جا پہنچے۔ ۸ ماہ تک پولیس سے آنکھ مچولی کھیل کر آخر وہ گرفتار ہو گئے۔ منڈیلا نے عدالت کے سامنے انتہائی جرأت مندانہ بیان دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ایسے نظام کے متمنّی ہیں جہاں لوگوں کو یکساں حقوق ملیں اور سب مل جُل کر رہیں یہ میرا مطمعٔ نظر ہے جس کے حصول کیلئے مجھے زندگی کی ضرورت ہے اور اگر اسے پورا کرنے کیلئے مجھے جان کا نذرانہ دینا پڑے تو بھی میں تیار ہوں۔ ......

ان آخری الفاظ کے بعد جو انہوں نے اپنی قوم سے کہے تھے وہ منظر سے غائب کر دیئے گئے مگر صرف جسمانی طور پر۔ ۲۸ سال انہوں نے اپنے عوام کے دلوں پر حکومت کی' ان کی قید اور رہائی دونوں فاشسٹوں کیلئے نہ ختم ہونے والا عذاب تھا۔ ان کی رہائی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھی کہ وہ عوام کا دیوتا تھا جیل میں اوجھل ہونے کے باوجود وہ طویل القامت شخص اسی طرح جواں ہمت اور صحت مند رہا۔ ...... ایک نظم میں کہا گیا تھا۔

مگر نیلسن
جیل کے غار سے کہہ رہا ہے
سیہ فام انسان
چاوڑے اور کدالیں بے لب آئیں گے
تو اس خطۂ ارض کا گہن چھٹ جائے گا

کالے سورج کی گرمی سے فولاد کی بیڑیاں موم بن کر پگھل جائیں گی
ظلم کے کوہِ ابیض کا ایک ایک ذرّہ
بکھر جائے گا
اور آزادیاں چار سُو پھول برسائیں گی
منڈیلا اسی روز زنداں کو چھوڑے گا
پہلے نہیں

بقول آزاد

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے' کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیورو کریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے 'محکومی اور غلامی کیلئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے' پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی 'مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک وقوم کو نجات دلاؤں' اصلاحات اور بتدریج توسیعِ اختیارات کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہئے ایسی ہی بات ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائداد اور قرضدار کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہئے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے تو قرض دار کو یہی کرنا پڑے گا کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہو گا اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا' موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے'' لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں اگر ایسی گورنمنٹ کو ظالم اور یا درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ نہ کہوں تو کیا ''عادل'' اور نہ تو ''درست'' ہو نہ مٹو کہوں؟ کیا یہ صرف اس لئے کہ ظالم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے 'اس کا حقدار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے' میں اٹلی کے نیک اور حریت پسند جوزف میزنی کی زبان میں کہوں گا ہم صرف اس لئے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اب سوال کیا ہے...... میرے سامنے جو سوال ہے وہ میرے وطن کی دیوالیہ سیاست کو

پیشِ نظر رکھتے ہوئے پیدا ہوا ہے کہ اس قوم میں کوئی گرامچی، کوئی منڈیلا، کوئی آزاد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ بھٹو صاحب کی ضیاء کی فوجی عدالتوں کے سامنے کی جانے والی تقریروں کا بڑا چرچا رہا لیکن اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو وہ زیادہ تر دفاعی اور خود پر چاری پر مشتمل تھیں مثلاً یہ الفاظ جو بھٹو صاحب نے عدالت میں جوش سے کہے تھے ان کی اس کیفیت کا اظہار ہیں۔

"ان دنوں کا تعلق ماضی سے ہے لیکن ہم ان دنوں سے گزر گئے اور میں اس ملک کے ہر شہری کی نسبت اس امر سے زیادہ آگاہ ہوں کہ ہمارا ہر لمحہ، ہر گھڑی، ہر دن کیسے گزرا وہ دن پاکستان کیلئے اتنے خطرناک تھے پوری تیز رفتاری اور دانش مندی کے بعد میں نے پوری سُرعت کے ساتھ داغ دھبوں کو مٹا دیا میری حکومت نے پوری جرأت کے ساتھ چیلنج کو قبول کیا اور ناقابلِ تسخیر مشکلات پر قابو پایا"۔

اور اب بے نظیر نے کہا کہ عوام قیادت اور اُمنگ چاہتے ہیں میرا سوال بھی یہ ہے کہ آج پاکستانی قوم کا المیہ یہی ہے کہ وہ قیادت سے محروم ہے اور اپنی اُمنگوں کی جنگ اکیلے لڑ رہی ہے، ہم اپنے سیاسی دیوالیے پن کی آخری حدوں پر پہنچ چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے انفرادی طور پر حکومت کے عتاب کا نشانہ ہیں، جیلوں میں بند ہیں، اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر بہت سے اخلاقی مجرموں نے خود کو سیاسی قیدی بنا کر پیش کرنے کی کوششیں کیں اور اپنا قد اونچا کرنا چاہا۔ مساوات کی ایک رپورٹ کے مطابق کراچی کی سنٹرل جیل میں ۸۹ء میں دو سو قیدیوں نے خود کو سیاسی قیدی بنا کر پیش کیا اور ان میں سے ننانوے فیصد اخلاقی مجرم تھے۔آخر اس کا فائدہ کیا تھا؟...... جبکہ سیاسی قیدی تو انتہائی تشدّد کا شکار ہوتے ہیں اِس کا جواب یہ ملتا ہے کہ عام قیدیوں کے مقدمات اور ان کی سزاؤں میں معافی کی پیش رفت قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہوتی ہے جبکہ سیاسی قیدیوں کو سزا دینے یا معاف کرنے کا کوئی لگا بندھا نظام نہیں ہے۔ حکومت کسی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر فیصلے کرتی ہے۔ سیاسی قیدی بننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ قانون کے جال سے نکلنے کیلئے خفیہ سُرنگ استعمال کر سکتے ہیں، عام قیدی ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کر سکتے ہیں جبکہ سیاسی قیدیوں کو یہ سہولت روزانہ حاصل ہے، عام قیدیوں کے مقابلے میں سیاسی قیدی کیلئے لائی جانے والی چیزیں تلاشی سے مبرا ہوتی ہیں، اس کے علاوہ کھانا پینا غرض جیل کے قوانین جن پر عملاً کچھ نہیں ہوتا بظاہر سیاسی قیدیوں کے حق میں جاتے ہیں۔ لہٰذا پاکستانی قوم سیاسی قیدی بننا چاہتی ہے تاکہ اسے اچھا کھانا، اچھا پہننا اور اچھی رہائش مل سکے۔ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ قید، کوڑے اور پھانسیاں سیاسی اسیروں کے ماتھے کا جھومر ہیں

دوسری طرف ہم قومی سطح پر قید ہو چکے ہیں۔ آسائشوں کے ہاتھوں بِک چکے ہیں، ہم جدّوجہُد سے دُور ہیں لہٰذا آزادی سے بھی دُور ہیں اور جانے کب تک دُور رہیں۔ ...... سورج کے اس سفر میں جہاں آگ کا کیمیائی فارمولا ہمیں ہر لمحہ چمک چمک کر تبدیلی اور انقلاب کی طرف بُلا رہا ہے۔ ہم پرومی تھیُس نہیں بن سکتے، ہمیں انسان کے اس نئے جنم کا انتظار کرنا ہو گا وُہ طلوع ہوتا ہوا انسان جو کوہ قاف کی سب سے اونچی چوٹی کے اس اوّلین جیل خانے میں قید ہونے کو تیار ہو گا اور جس کیلئے ایس کائی لیس نے کہا تھا۔

نسلِ انسانی پر تمہاری شفقت وعنایت نے تم کو یہ دن دکھائے ہیں
تم وہ دیوتا ہو جو دیوتاؤں کے عتاب کے آگے نہیں جُھکا۔

گوہر سلطانہ عظمیٰ

عزیمت و استقامت

مصائب و آلام ، رنج و محن ، ابتلاء و آزمائش ، زنجیر و سلاسل ، کوڑے و تازیانے ، جیل خانے و بندی خانے ، دار و رسن ، پھانسی کے پھندے اور تختۂ دار ہر عہد اور ہر دور میں حق پرستوں ، آزادی خواہوں اور حریّت پسندوں کا مقدر رہا ہے۔ مدعیانِ دین ، بانیانِ مذاہب ، محققین ، مکتشفین ، مصلحین ، مفکّرین الغرض جس نے بھی انسانی عزّ و شرف ، عظمت و توقیر اور احترامِ آدمیّت کے حق میں لب کشائی کی ، فرسودہ رسم و رواج اور کہنہ روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ، حق گوئی کے جرم کی پاداش میں گنہ گار ٹھہرایا گیا ، مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ پھانسی کے پھندے اور قید خانے ان کا مسکن بنے۔ اہلِ حق کی کونسی جماعت ہے جسے آزمائش اور امتحان کے مراحل سے گزرنا نہیں پڑا۔ تاریخ کے اوراق حق کے نام لیواؤں اور صداقت کے پانی دیواؤں کی استقامت و عزیمت کی داستانوں اور ابتلا کی سرگزشتوں سے معمور ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کے یہی ابواب قابلِ فخر ، لائقِ تقلید ، نشانِ راہ اور روشنی کے مینار ہیں۔ کوئی زمانہ کلمۂ حق کی گونج سے خالی نہیں رہا۔ قدرت کسی فرد یا گروہ کو حق گوئی کی توفیق عطا فرماتی ہے اور وہ اپنے عہد کی طاغوتی ، جبروتی اور استکباری قوتوں سے ٹکرا کر ان کا غرور ، تکبّر اور نخوت خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس کی جرأت مندی ، بہادری ، دلاوری ، دلیری ، بےباکی ، شجاعت ، استقامت اور عزیمت دیکھ کر دنیا پرستوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ کوئی ظلم ، کوئی جبر اور رکاوٹ ان کو اعلائے کلمتہ الحق سے نہیں پھرا سکتی۔ انہوں نے دعوتِ حق کا جو کام شروع کیا ہوتا ہے وہ جاری اور ساری رہتا ہے۔

مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تذکرہ" میں اصحابِ استقامت و عزیمت اور دعوتِ عزیمت کا بڑا پُر جوش ذکر کیا ہے' ان کے علم و فضل' زہد و تقویٰ' ورع اور ثابت قدمی کی داستانیں بیان کی ہیں۔ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا' کہ ان کا تعلق' ناطہ اور رشتہ اہلِ حق کے اس خانوادہ سے ہے جسے ابتلاء و آزمائش' مصائب و آلام اور رنج و محن راہِ حق سے نہ ہٹا سکے۔ ان کی استقامت و عزیمت کا یہ عالم تھا کہ انہیں گڑھوں میں کھڑا کر کے آرہ سے چیرا گیا' ان کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھیرائی گئیں' جو گوشت کو ہڈی اور پٹھوں سے جدا کر دیتی تھیں' لیکن عزیمت کے کہساروں نے استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا سب کچھ ہنسی خوشی سہہ لیا اور اظہارِ حق سے منہ نہ موڑا۔ جابر حکمرانوں' دین فروش مولویوں اور درباری ملاّؤں کے ہاتھوں اہلِ حق کو جو تکالیف' اذیتیں اور مصائب برداشت کرنا پڑے' تذکرہ میں ان کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے احوال میں لکھتے ہیں کہ انہیں لگاتار تین عظیم الشان فرماں رواؤں یعنی مامون' معتصم اور واثق باللہ کی شمشیرِ استبداد و قہرِ حکومت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے ضرب و حبس سے آزمائش کی اور متوکل نے تعظیم و تکریم اور عطاو بخششِ دنیا سے' لیکن "فکان فیہما معتصما باللہ عزوجل" ان کی استقامت و عشقِ حق پر نہ تو خوفِ دنیا غالب آیا اور نہ طمعِ دنیا' دونوں کسوٹیوں پر ان کا سونا یکساں طور پر کھرا نکلا!

بندگان تو کہ دَر عشقِ خداوند اند
دُرِ جہانِ را بہ تمنائے تو فروختہ اند!

امام موصوف نے مسئلہ خلقِ قرآن سے اختلاف کیا' قید خانے میں رہنا' ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا اور ایسے تہہ خانوں میں محبوس ہونا جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہ تھا ان کا مقدر بن گیا۔ "چار چار بوجھل بیڑیاں ان کے پاؤں میں ڈالی گئیں' پہن لیں' اسی عالم میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی کی مدد کے خود ہی اونٹ پر سوار ہوں اور خود ہی اُتریں۔ اس کو بھی قبول کر لیا۔ بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے' اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک میں عشرۂ آخر میں جس کی طاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعات سے زیادہ محبوب ہے' بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارفِ نبوت کی حامل تھی' لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر تازہ دم جلاد اس کی جگہ لیتا' اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کر لیا..... حافظ ابن جوزی نے محمد بن اسماعیل کا قول نقل کیا ہے..... احمد بن حنبلؒ کو اسّی کوڑے ایسے سخت مارے گئے کہ اگر ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو وہ چیخ اٹھتا۔ مگر اس کوہِ عزم و ہمت نے اُف تک نہ کی" امام موصوف اپنے مؤقف پر سختی سے ڈٹے رہے اور اظہارِ حق سے باز نہیں آئے۔

عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد امام موصوف کے ساتھ ہی قید کیے گئے تھے مگر شدائد اور محن کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے رہائی پائی' بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی اور رخصت کی پناہ گاہ ڈھونڈی اور طغیان و طوفان میں کواڑ بند کر کے بیٹھ گئے لیکن امام موصوف کو حق پرستی کا ایسا نشہ چڑھا ہوا تھا کہ وہ ظلم و مصائب سے گھبرا کر عوام کو ان کے حال پر چھوڑنے اور اپنے وجود کو بچانے پر آمادہ نہ تھے وہ تو راہِ حق میں انگاروں کو ہاتھ میں لینے کے لئے تیار تھے کہ اصحابِ عزیمت کا شیوہ یہی ہے۔ ان کے نزدیک رخصت کا نام لینا معصیت سے کم تر نہیں۔

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضربِ تازیانہ کے لئے حکم دیا تو وہ علماء اہلِ سنت بھی دربار میں موجود تھے جو شدّتِ محن و مصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے ایسی ہٹ کی جو تم کر رہے ہو۔ مولانا رقمطراز ہیں: ''عین حالتِ صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا' تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہو گئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا' پی لو' مگر انکار کر دیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔'' وہاں سے امام موصوف کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے ظہر کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔ ابنِ سماعہ نے امامت کی اور امامؒ موصوف نے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ابنِ سماعہ نے کہا: ''تم نے نماز پڑھی حالانکہ خون تمہارے کپڑوں میں بہہ رہا ہے' یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟'' امامؒ موصوف نے جواب دیا: ''میں نے وہی کیا' جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انہوں نے نماز پوری کی۔''

مولانا رقمطراز ہیں: ''ابنِ سماعہ کے جواب میں حضرت امامؒ نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لئے بس کرتی تھی' مگر میں پوچھتا ہوں کہ جو خون اس وقت امام احمد بن حنبلؒ کے زخموں سے بہہ رہا تھا' اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی تو پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے' جو انسان کو پاک کر سکتی ہے' اور کونسا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا ہے؟ اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان! اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر نچھاور!''

''......یہاں طہارتِ جسم و لباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی' تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئی تھیں' اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس و مطہر کر دیا تھا۔ جس کے عشق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں' جس کی خاطر سارا جسم زخموں سے چُور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا' اسی کے آگے جبینِ نیاز جھکی ہوئی' اسی کے ذکر میں قلب و لسان لذت یاب تسبیح و تحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشمِ شوق وقفِ نظارہ و دید! اور اسی

کی یاد میں روحِ مضطر محو و سرشارِ عشق و خود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے!

حضرت مالکؒ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ یمین و طلاق کے مکروہ ہونے کے مسئلہ پر بادشاہ منصور عباسی سے ٹھن گئی اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ بڑی استقامت و عزیمت دکھائی صعوبتیں برداشت کیں، تشدد کا سامنا کیا۔ مشکیں اس زور سے کس کر باندھ دی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسمِ اقدس پر پڑ رہی تھیں، تو اسی اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لئے سوار کرایا گیا تھا اور کہا ۔ "جو جانتا ہے سو جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا جان لے، کہ میں ہوں مالکؒ انس کا بیٹا، اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا رہا ہے کہ طلاق سے مکروہ کوئی چیز نہیں۔"

جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس لاہور (18 اکتوبر 1921ء) کے تحریری خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ "آپ حضرت امامنا الاعظم امام ابو حنیفہؒ کو دیکھئے کہ قید خانہ بغداد میں اسیر ہیں لیکن اس پر بھی قاہر بادشاہ کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکتا۔ آپ کو حضرت امام شافعیؒ اس حالت میں نظر آئے کہ یمن سے بغداد تک قید و اُسر کی حالت میں بھیجے جا رہے ہیں اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ حق کے داعی ہیں اور صدق و ہدایت پر قائم ہیں...... شیخ الاسلام احمد بنِ تیمیہؒ کو دیکھئے کہ تین تین مرتبہ مصر کے قید خانے میں اسیر کئے گئے اور بالآخر قید خانے ہی میں وفات پائی مگر اظہارِ حق سے منہ نہ موڑا اور حکومتِ وقت کے آگے سرِ اطاعت خم نہ کیا...... اسی ہندوستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو دیکھئے کہ قلعہ گوالیار میں قید ہیں مگر جہانگیر کے آگے سر جھکانے کے لئے تیار نہیں۔"

"تذکرہ" میں اصحابِ عزیمت و استقامت اور حق فروشوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اس وقت اور پہلے ادوار کا موازنہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ "یہ افسانہ تو اس عہد کا ہے جس کو موجودہ عہد کے مقابلے میں عہدِ اقبال سمجھنا چاہئے۔ آج جو حالت ہو رہی ہے اس کو دیکھئے تو ہوش گم اور عقل درماندہ رہ جاتی ہے۔ حق کی بے کسی و مظلومی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جنگل میں بھیڑوں اور بکریوں کے لئے چرواہا نظر آ جاتا ہے لیکن حق کے لئے کوئی غم گسار و مددگار نہیں۔"

جلاوطنی سے قبل

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی سوچ کا زاویہ اُس عہد میں رائج افکار و نظریات سے بالکل مختلف بلکہ اجنبی تھا۔ "الہلال" باغیانہ اور جارحانہ اُسلوب کے باعث حکومت کے عتاب کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس کی جگہ "البلاغ" کا اجراء ہو چکا تھا۔ اگرچہ "البلاغ" کا اسلوب "الہلال" سے کافی دھیما، مدھم اور ملائم تھا لیکن حکومت اسے بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ دراصل پہلی جنگ عظیم کے

پھوٹ پڑنے سے حکومت کچھ زیادہ ہی حسّاس اور نازک مزاج ہو چکی تھی اور اس کے عالمی سامراجی مفادات معمولی نوعیت کا اختلاف بھی برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ مولانا اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے اور وہ برطانوی استعمار پر حملہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولانا کا طرزِ عمل حکومت کے لئے شدید ناگوار اور ناقابلِ برداشت تھا۔ حکومت بھلا سرزمینِ ہندوستان سے باغیانہ آواز بلند ہوتے ہوئے کیسے گوارا کر سکتی تھی؟ چنانچہ مولانا کے جلاوطنی یا نظر بند کئے جانے کا چرچا عام تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی پھیلی ہوئی تھی کہ مولانا آئندہ جمعہ مسجدِ ناخدا میں ادا کریں گے۔ اس مسجد سے مولانا کو خاص تعلقِ خاطر تھا کہ یہ ان کے والد بزرگوار نے تعمیر کرائی تھی۔ چنانچہ جمعہ کے روز غم و غصّہ اور رنج و غم سے مغلوب عوام کثیر تعداد میں جمعہ ادا کرنے مسجدِ ناخدا میں جمع ہوئے اس کا حال عینی شاہد مولانا ابو مصلح لکھتے ہیں:۔

"کلکتہ میں میرا قیام تھا اور رہائش مسجد ناخدا کے قریب تھی۔ جو شہر کے مسلمانوں کا مرکزی مقام بھی ہے۔ کچھ دنوں پیشتر سے یہ خبر عام ہو گئی کہ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند کئے جا رہے ہیں اور آئندہ جمعہ کی نماز وہ مسجدِ ناخدا میں ادا کریں گے۔ جس کے بعد ان کو یہاں کے لوگوں سے نہ جانے کب تک کیلئے جدا ہونا پڑے گا اور کلکتہ کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ وقفہ کے دن عوام کے لئے ایک طرح کے غم و غصہ اور رنج و غم میں گزرے اور جمعہ کا دن آیا۔ آج صبح سے نماز کی صف میں آگے بڑھ کر جگہ لینے کی فکر ہر شخص کو دامن گیر تھی۔ راستہ بند ہو گیا ٹریفک رُک گئی۔ ٹراموے وغیرہ کی آمدورفت کو بند ہو جانا پڑا۔ اس لئے کہ مسجد کا اندر کا حصہ، صحنِ مسجد کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ لوگوں کو خیال تھا کہ شاید مولانا کوئی تقریر کریں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مصری خطیب نے خطبہ دیا اور نماز جمعہ ختم ہوئی۔ دُعا کے بعد مولانا اپنی جگہ سے اٹھے۔ ہجوم نے دست بوسی کی بے تابانہ کوشش شروع کر دی جس کی وجہ سے مسجد سے باہر آنے میں کافی وقت لگا۔ مولانا عالمانہ لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔ پنجابی نما عمامہ سر پر تھا، سنہری عینک آنکھوں پر لگی ہوئی تھی۔ شیروانی کے اوپر عبا اوڑھے ہوئے تھے۔ بہرحال مسجد کے دوسرے دروازے سے ٹراموے کے راستہ پر آئے تو کئی موٹر نشین اپنی اپنی موٹر لئے ہوئے موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ مولانا ان کی موٹر میں بیٹھیں۔ موٹروں میں غالباً ایک موٹر جناب حسین شہید سہروردی صاحب کی بھی تھی۔ مگر معلوم نہیں یہ سعادت کس کے حصہ میں آئی۔ میں نے اپنا یہ موزوں کیا ہوا شعر خود ہی کہا اور خود ہی سنا کا مصداق بنا ہوا روانہ ہو گیا"۔

آزادیاں ہوں قرباں قیدِ بلا پر تیری
جا اے مرے مسافر تجھ کو خدا پہ چھوڑا

جلاوطنی اور نظر بندی

اواخر مارچ 1916ء

"الہلال" کی بندش کے کچھ عرصہ بعد " البلاغ " کے نام سے نیا پریس قائم کیا اور اسی نام سے ہفت روزہ بھی جاری کیا۔ مولانا "انڈیا ونز فریڈم " میں کہتے ہیں۔ "حکومت کو اب احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے تحت کارروائی کر کے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کا سہارا لے کر مجھے کلکتہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ انہی قوانین کے تحت پنجاب، دہلی، یو۔ پی اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے اپنے صوبوں کی حدود میں داخل ہونے کی ممانعت کر رکھی تھی اب میں صرف بہار جاسکتا تھا میں رانچی چلا گیا۔ چھ ماہ بعد مجھے رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور میں 31 دسمبر 1919ء تک یہاں حراست میں رہا۔ یکم جنوری 1920ء کو دوسرے نظر بندوں اور قیدیوں کے ساتھ انگلستان کے اعلان کے مطابق رہا کیا گیا"۔

ترجمان القرآن کی جلد اوّل کے دیباچہ طبع اوّل کے صفحہ اوّل پر جلاوطنی کے زیرِ عنوان رقمطراز ہیں۔ "3 مارچ 1916ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس[1] کے ماتحت مجھے حدود بنگال سے باہر

[1] ..... جنگ کے زمانے میں جو موقت احکام نافذ کئے گئے تھے ان میں ایک آرڈی ننس "ڈیفنس آف انڈیا" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ آرڈی ننس حکومتِ ہند اور مقامی حکومتوں کو اختیار دیتا تھا کہ بغیر عدالتی کارروائی کے جس کو چاہیں ہندوستان یا ہندوستان کے کسی صوبے سے جلاوطن یا نظر بند کر دیں۔

چلے جانے کا حکم دیا.......... چونکہ اس آرڈی ننس کے تحت دہلی ' پنجاب ' یوپی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں میرا داخلہ روک چکی تھیں ' اس لئے اب صرف بہار اور بمبئی کے دو صوبے رہ گئے تھے جہاں میں جاسکتا تھا۔ میں نے رانچی منتخب کیا۔"

مولانا آخری بار 9 اگست 1942ء کو علی الصبح بمبئی سے گرفتار کئے گئے اور بقول ان کے "سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک ان کے پیچھے بند کر دیا گیا" اس گرفتاری کے ٹھیک دو یوم بعد 11۔ اگست کو انہوں نے اپنے "صدیقِ مکرّم" کو جو مکتوب لکھا اس میں کلکتہ چھوڑنے رانچی میں مقیم ہونے اور نظر بندی پر تاثرات بیان کئے ہیں۔ ان کے لئے یہ اس نوع کی ابتلاء و آزمائش کا پہلا مرحلہ تھا جو بعد میں مزید سنگین ہو گیا۔ لکھتے ہیں:۔

1916ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا ' کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے ستائیس برس گزرے تھے۔ "الہلال" "البلاغ" کے نام سے جاری تھا ' "دارالارشاد" قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا ' اور مشغولیت کی ڈوبی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلابِ حال میں طبیعت کے لئے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا:۔

نقصاں نہیں جنوں میں ' بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں!!

"تذکرہ" صفحہ 310 پر لکھا ہے کہ 23 مارچ 1916ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ نمبر 3 کی بنا پر حکم دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں ان الحکم الا اللہ!

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب؟
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا

30 مارچ کو کلکتہ سے کہ سالہا سال کے مستقل قیام کی بنا پر بے جا نہیں اگر وطن کہوں ' نکلا ' اور رانچی پہنچا:

نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہلِ ریا را ' کہ زمیدان رفتم!

"البلاغ" کے آخری شمارے میں لکھتے ہیں۔

"28 مارچ کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ نمبر 3 ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دوں اور حدودِ بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ بعد کو یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھا دی گئی۔"

ترجمان القرآن کی جلد اوّل کے دیباچہ اوّل کے صفحہ نمبر 4 پر کلکتہ سے روانگی کی تاریخ 3 مارچ طبع

ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ یا تو کاتب کا سہوِ قلم ہے یا پھر طباعت کی کرشمہ سازیاں کہ تین سے پہلے صفر غائب ہو گیا اور سنگ ساز نے درستگی کی زحمت گوارا نہ کی۔ یہ دیباچہ مولانا نے 16 نومبر 1930ء کو لکھا جب وہ ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں قید تھے۔

''غبارِ خاطر'' کے مکتوب 11 اگست 1942ء میں روانگی کی تاریخ 7 اپریل لکھی ہوئی ہے یہ مکتوب اس واقعہ پر ساڑھے چھبیس برس گزرنے کے بعد قلعہ احمد نگر میں صرف حافظہ کے اعتماد پر لکھا گیا۔ اس لئے زیادہ قابلِ اعتماد روایت تو ''البلاغ'' کی ہے لیکن اس سے روانگی کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا بہرحال یہ قیاس کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ وہ اواخر مارچ میں کلکتہ چھوڑ کر رانچی تشریف لے گئے تھے۔ مولانا نے رانچی شہر سے باہر موراباری گاؤں میں تنہا قیام کیا۔ اگرچہ کلکتہ سے روانگی کے وقت اکثر احباب و اقارب ساتھ چلنے پر مصر تھے لیکن مولانا نے اجازت نہ دی۔

حکومت کے اقدام کے خلاف عوام کا میمورنڈم

حکومت کے اقدام کے خلاف عوام نے شدید ردِّعمل ظاہر کیا۔ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ دستخطوں سے یادداشت حکومت کو پیش کی گئی جس میں مولانا کی جلاوطنی ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی یادداشت تھی جس پر اتنی زیادہ تعداد میں لوگوں نے دستخط کئے تھے۔ اس سے صاحبِ ''الہلال'' کی عظمت، مقبولیت، شہرت اور ہر دل عزیزی اور ان کے ساتھ عوام کی محبت، مؤدت، عقیدت اور ارادت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن حکومت کے بہرے کانوں پر اس گونج کا کوئی اثر نہ ہوا اگرچہ حکومت کو اپنی غلط فہمیوں کا اعتراف تھا۔

قیامِ رانچی کی سرگرمیاں

سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔ رانچی کا عجب حال تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ جس کی بہت بڑی آبادی حد درجہ پسماندہ تھی۔ مقامی آبادی میں صرف عیسائیوں میں تبلیغی مشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ تعلیم یافتہ تھے وہ عام طور پر دوسری جگہوں سے آکر آباد ہوئے تھے۔ کچھ سرکاری ملازم تھے اور کچھ وکیل ڈاکٹر یا تاجر۔ یہ صورتِ حال بڑی افسوسناک تھی۔ مولانا کے وہاں پہنچتے ہی مقامی لوگ ان کے گھر جمع ہونے لگے لیکن دلوں میں عقیدت رکھنے کے باوجود اکثر پڑھے لکھے لوگ ان سے دُور رہتے تھے کیونکہ مولانا حکومت کی نظر میں ''خطرناک'' آدمی تھے۔ مولانا کے ہاں مقامی آبادی کا آنا جانا تھا۔ زیادہ تر لوگ کلکتہ سے آتے تھے اور تحفے تحائف ساتھ لاتے تھے۔ مولانا پابندی کے ساتھ پانچ وقتوں کی نماز قریب کی مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ شب کا وقت تھا عشاء کی نماز پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا فرما رہے تھے کہ برسات شروع ہو گئی شرابور ہو گئے مگر نماز اپنے وقت پر ختم ہوئی۔

یاد رہے کہ رانچی ہندوستان کا وہ مقام ہے جہاں اوسطاً بارش پورے ہندوستان سے زیادہ ہوتی ہے۔

مولانا نے نمازِ جمعہ کے بعد ایک مسجد میں خطبہ دینا شروع کیا۔ جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ شہر اور دیہات کے لوگ ان خطبوں میں شریک تو ہوتے تھے لیکن معدودے چند کے سوا شاید ہی کوئی کچھ سمجھ سکتا تھا۔

مولانا لکھتے ہیں:۔ جس مقام پر میں مقیم ہوں، شہر یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن جامع مسجد گیا۔ چند صفوں سے زیادہ مجمع نہ تھا۔ لوگوں نے خطبہ وامامت کے لئے سخت اصرار کیا مجبوراً خطبہ دینا پڑا۔ ان بے چاروں نے اب تک خطبہ کے یہی معنی سمجھے تھے، کہ عربی کی کوئی چھپی ہوئی کتاب پڑھ دی جائے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ خاصی اچھی ہے مگر ایک گمنام گوشے میں پڑ جانے کی وجہ سے حد درجہ تباہی و بدحالی میں مبتلا ہیں۔ نمازِ جمعہ کے بعد ایک قوی داعیہ قلب میں محسوس ہو رہا ہے، کہ اگر حالات طولِ قیام کا باعث ہوئے تو یہاں بھی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ دنیا نے آزادی کے زمانے کے کاموں کا کچھ نہ کچھ نمونہ دیکھ لیا ہے۔ بہتر ہے کہ جلاوطنی و نظر بندی کے بند و قید میں کام کرنے کا بھی ایک نمونہ دکھلا دیا جائے، کہ اصل آزمائش گاہِ عمل یہی ہے ؂

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر !!

مولانا کو بنگال سے نکالنے کا حکومت کا مقصد یہ تھا کہ انہیں عوام سے جُدا کر دیا جائے لیکن رانچی میں بھی ان کے گرد ہجومِ عاشقاں اکٹھا ہو گیا۔ مولانا نے اس موقع کو ضائع نہیں جانے دیا عوام میں سیاسی بیداری اور دینی شعور جگانے لگے۔

سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ مولانا نے رانچی کے مسلمانوں کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اصلاح کی جانب توجہ مبذول فرمائی۔ اس مقصد کے لئے انجمنِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اس کی نگرانی میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں یہ کام ذرا سخت تھا۔ ہندوستان کی قومی تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن عام لوگوں کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ کہ رانچی کے مسلمانوں کی عام آبادی غریب تھی۔

مدرسے کے قیام کے لئے فنڈ اکٹھا کرنا مقامی طور پر تقریباً ناممکن تھا۔ پھر بھی جب مولانا نے اپیل کی تو اکثر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ۔ لیکن اس وقت کا رانچی، آج کا رانچی نہیں تھا۔ مولانا نے اپنے کلکتہ کے دوستوں اور عقیدت مندوں کے پاس الطاف حسین خان صاحب کو بھیجا اور کافی سرمایہ جمع ہو گیا۔ جس سے انجمن اور مدرسے کی عمارت بن گئی۔ بعد میں کلکتہ کے بعض اہلِ خیر مسلمانوں نے سوچا کہ روپیہ اکٹھا کر کے اتنی عمارتیں بنا دی جائیں کہ کرایہ کی آمدنی سے مدرسہ اور انجمن کے اخراجات پورے ہوتے رہیں اور ایسا ہوا بھی۔ لیکن مولانا کے رانچی سے چلے جانے کے بعد پورے

پروگرام کی تکمیل نہ ہو سکی۔ البتہ انجمن اور مدرسہ اب بھی قائم ہے بلکہ بعض نوجوانوں نے اس سے ملحق ایک ہائی اسکول بھی قائم کر لیا ہے جو مولانا کے نام سے منسوب ہے اور قابلِ قدر خدمت انجام دے رہا ہے[1]

مولانا جب رانچی میں قیام فرماتے تھے تو وہاں کا عجب حال تھا............ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان تھا اور غریبی بھی تھی۔ مسلمانوں کا صرف ایک طبقہ خوش حال تھا جو دیسی شراب کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ لوگ شہر میں آباد تھے اور دیہاتوں میں بھی۔ مولانا نے اپنے خطبوں میں دینی اور سماجی مسئلوں پر روشنی ڈالی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے مسلمانوں نے شراب کا کاروبار ترک کر کے دوسری تجارتیں شروع کر دیں حالانکہ ان مسلمانوں کا یہ خاندانی پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ بہ ظاہر انہیں بڑا مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

ان دنوں رانچی میں دوسرا بڑا جھگڑا حنفی اور وہابی کا تھا۔ چونکہ مقامی مسلمانوں میں اتنا علم نہ تھا کہ سمجھ سکیں۔ اس لئے اکثر پیشہ ور مولویوں اور پیروں کے شکار تھے۔ جو کچھ یہ کہتے تھے یہ سیدھے سادے مسلمان مان لیا کرتے تھے۔ مولانا نے اس مسئلے پر متعدد خطبے رانچی کی مسجد میں دیئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کچھ لوگ مولانا کے مخالف ہو گئے اور انہیں بھی وہابی اور غیر مقلد سمجھنا شروع کر دیا لیکن یہ فتنہ بھی جلد دب گیا۔ اس کے ساتھ ہی حنفی اور وہابی کا جھگڑا بھی۔

مولانا آزاد کا قیام مورابادی کے ایک بنگلے میں تھا۔ یہ بنگلہ کلکتہ کے ایک مسلمان تاجر کا تھا۔ حکومت نے جو وظیفہ ان کے لئے مقرر کیا تھا وہ بالکل ناکافی تھا۔ وہ خود بڑی صاف ستھری زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ پھر مسلسل مطالعے کا شوق اور مطالعے کے لئے بہت زیادہ روپوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ نئی نئی کتابیں، اخبارات رسالے اور سب کے بعد مہمانی کا سلسلہ۔ مولانا سے ملنے کے لئے سارے ملک سے لوگ آیا کرتے تھے۔ ان میں علماء ہوتے تھے جن کی مدد مولانا کو کرنا پڑتی تھی اور مولانا کے آمدنی کے ذرائع محدود ہی نہیں بلکہ مفقود تھے لیکن کسی نے ان کا منہ میلا نہیں دیکھا اور نہ کبھی انہوں نے مدد چاہی۔ بلکہ مولانا کے رانچی سے واپس جانے کے بعد پتہ چلا کہ مدرسہ کی عمارت کی دوسری منزل انہوں نے اپنے روپوں سے بنوائی تھی جو انہیں پریس فروخت کر کے حاصل ہوئے تھے۔

یہ تو درست ہے کہ ان دنوں مولانا کو صرف رانچی ہی میں نہیں بلکہ سارے ملک میں غیر معمولی ہردل عزیزی ان کی نظربندی کا سبب تھی۔ لیکن رانچی میں کچھ لوگ تھے جو برابر مولانا کے خلاف فتنہ پردازیوں میں مشغول رہتے تھے۔ ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن کو سرکاری عنایات اور خطابات کی توقع تھی اور مولانا کے وعظوں اور تقریروں کی وجہ سے جن کی برتری کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ اس کا موقع نہیں کہ ان لوگوں کے نام لکھے جائیں ان باتوں سے بحث کی جائے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے بعض پیشہ ور مولویوں کو روپے دے کر بلوایا اور مناظرے کی تیاریاں کیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو بھی آیا۔ وہ مولانا

[1] ...... اب تو مولانا آزاد کے نام پر کالج بھی قائم ہے اور جہاں علم کی کوئی صحبت بہم نہیں تھی وہاں یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔

سے چند باتیں کرنے کے بعد ان کے بنگلے سے سر جھکائے اور ان کے رنگ میں رنگا ہوا نکلا۔

مولانا نے چند سال جو رانچی میں گزارے ' وہ رائیگاں نہیں گئے۔ بلکہ اس کا اثر بہت دیر پا رہا۔ وہاں کے عام مسلمانوں میں دین داری کے علاوہ قومی رجحانات ہمیشہ بہت طاقتور رہے۔ اتنے طاقتور کہ بڑے بڑے طوفان بھی انہیں ہلا نہیں سکے۔

مولانا آزاد کی رانچی کی زندگی کئی حیثیتوں سے بے حد اہم تھی۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ باضابطہ اس کی تحقیقات کی جائے۔ اب بھی رانچی اور بہار میں ایسے افراد موجود ہیں جو مولانا سے اس دور میں بہت قریب تھے۔ .... اور بعض دوسرے لوگ رانچی کی زندگی پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

شورش کاشمیری رقم طراز ہیں کہ سید سلیمان ندوی نے یوسف " ثانی " کے عنوان کے تحت مولانا کی رانچی میں نظر بندی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

" رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم سب میں اُجالا ہو گیا۔ مولانا نے نظر بندی کا یہ زمانہ جس عزم و استقلال ' استغنا اور قوتِ ایمان کے ساتھ بسر کیا وہ آئمہ سلف کی یاد تازہ کرتا ہے۔ "

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے رانچی میں قیام کے دوران بڑے اہم کام سرانجام دیئے۔عوام کو بیدار کیا ان میں سیاسی شعور پیدا کیا۔مسلمانوں کو مذہب سے آشنا بنایا جامع مسجد میں ایک سال تک درس قرآن حکیم ارشاد فرمایا۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا اعلیٰ پائے کا گرانقدر کام کیا جو خلوت نشینی کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ " غبارِ خاطر " کے مکتوب 29 اگست 1942ء میں لکھتے ہیں " لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں ' تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے ' کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے ' میرے لئے بسا اوقات نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں ' تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی ' اضطرار و تکلّف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈتا تھا ' بلکہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا ' جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا!

ما بنودیم بدیں مرتبہ راضی ' غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اس طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے تو اس حالت کی جو رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لئے اذیت کا موجب ہوتی ہیں میرے لئے یکسوئی اور بخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کر سکتیں۔ میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے ' تو حیران رہ جاتا ہوں ' یہ تنہائی کی حالت آدمی کے لئے سزا کیسے ہو سکتی ہے ؟! اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے حاصل کی جا سکیں!

حسدِ تہمتِ آزادیٔ سَردم بگداخت
کیں مرادیست کہ بر تہمتِ آں ہم حسدست

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے، جہاں اور لوگ بھی رکھے جاسکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان حضرت سے کہا: آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھِنی جارہی ہے: یہ تو وہی غالب والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

ترجمان القرآن کی جلد اوّل کے دیباچہ اوّل میں نظر بندی کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:

"8 جولائی 1916ء کو یکایک حکومتِ ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کر دیئے" مولانا اس پر مسرور و شادمان ہیں کہ انہیں تصنیف و تالیف کے لئے موقع ہاتھ آ گیا۔ اب وہ خلوت میں بیٹھ کر اطمینانِ خاطر، سکونِ قلب اور یکسوئی سے اس طرف متوجہ ہوں گے ویسے بھی دنیا کی بہترین ادبی و فکری تخلیقات جیل خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ مولانا کو آزادی سے محروم ہونے کا ذرّہ برابر غم نہیں ہے کیونکہ وہ لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوئے لکھتے ہیں:

"اب میرے اختیار میں صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ، نظر بندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا، اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں، تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں"

سیّد سلیمان ندوی "معارف" مارچ 1919ء میں لکھتے ہیں:۔

"زمانۂ قیامِ رانچی میں ایک سال تک جامع مسجد میں انہوں نے مسلمانوں کو قرآنِ مجید کا درس دیا، زیادہ تر اوقات تصنیف و تالیف میں بسر ہوئے۔ ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا مؤثر تفسیری ترجمہ اس زمانے میں ختم ہوا۔ "البیان" تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ تیئس پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب و سنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد مسائل "الصلوٰۃ" "الزکوٰۃ" "الحج" "النکاح" ترتیب دیئے۔ سوانح مجدّدین کا سلسلہ شروع کیا اور اس میں علامہ ابنِ تیمیہ، علامہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوانح و مجتہدات قلم بند کئے۔ ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنواناتِ علمی پر تحریر کیا۔ ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابنِ تیمیہ اور ابنِ

قیم یا شمس الائمہ سرخسی اور اُمیہ بن عبد العزیز اُندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں "

سیّد سلیمان ندوی نے زمانۂ نظر بندی اور جلا وطنی میں تصنیف شدہ بہت سے کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے۔ ان کے دعوے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مولانا نے ترجمان القرآن کی جلد اوّل کے دیباچہ میں صرف تین کتب ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر کے بارے میں لکھا ہے اور ان کی بربادیوں اور تباہ حالیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ترجمان القرآن انہوں نے 1918ء کے اواخر میں مکمل کر لیا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ ترجمان القرآن کی تیسری جلد کدھر گئی؟ دستیاب دو جلدیں کن کٹھن مراحل سے گزر کر زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکیں؟ مولانا نے اس کے پس منظر، حکومت کی ستم رانیوں اور محکمہ تفتیش حکومتِ ہند کے اعلیٰ آفیسر سر چارلس کلیولینڈ کی علم دشمنی اور معاندت سے نقاب سرکایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "1916ء میں جب " البلاغ " کے صفحات پر " ترجمان القرآن " اور "تفسیر البیان " کا اعلان کیا گیا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو پندرہ برس تک التوا و انتظار کی حالت میں معلق رہے گا اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ اور میرے ارادوں کی ناتمامیوں کے لئے ایک درد انگیز مثال ثابت ہو گا "

"لیکن وقت کی رفتار نے بہت جلد بتا دیا کہ صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ ابھی اس اعلان پر بمشکل چند مہینے گزرے ہوں گے کہ مولانا کو بنگال چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ اور دفعتاً " البلاغ " اور " البلاغ" پریس کے ساتھ تصنیف و طباعت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ " مولانا نے رانچی میں قیام کا فیصلہ اس خیال سے کیا تھا کہ کلکتہ کے قریب رہ کر شاید تصنیف و طباعت کا کام جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ان کی تمنائیں بھر نہ آئیں اور تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں وہ رقمطراز ہیں۔

" 1915ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا، تو بہ یک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر، میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی۔ عام تعلیم کے لئے ترجمہ، مطالعہ کے لیے تفسیر، اہلِ علم و نظر کے لئے مقدمہ "

" البلاغ " میں جب ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا، تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا، تفسیر سورہ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پا جائے، میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائیگا اور چھپ بھی جائیگا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائیگی "

" البلاغ " کے پہلے شمارے 13۔ نومبر 1910ء میں لکھتے ہیں۔ "قرآن حکیم کے ترجمہ و تفسیر کے دو مختلف کام اب ایک ہی وقت میں شروع ہو گئے ہیں اور بلا استثنا ہر روز تھوڑا سا وقت ان کے لئے بھی نکالنا پڑتا ہے علی الخصوص ترجمۃ القرآن کے لئے جہاں تک جلدی ہو سکے۔ اسے مکمل کر دیا جائے

کیونکہ ترجمہ کے ساتھ وہ بھی چھپتا جاتا ہے"۔

30مارچ 1916ء کو جب وہ کلکتہ سے روانہ ہوئے تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت کا کام شروع ہو گیا تھا۔ان کی کوشش تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ جون 1916ء میں پریس کا دوبارہ اجراء ہو گیا' اور مولانا نے مسوّدات کی ترتیب شروع کر دی۔ لیکن 8جولائی کو یکایک حکومت نے مولانا کو نظر بند کر کے باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع کر دیا۔ مولانا خوش تھے کہ اب سکون و آرام سے خلوت میں کام کرنے کا موقع ملے گا وہ اس عالم میں پوری زندگی بسر کرنے کے لئے تیار تھے لیکن یہ سرابِ خیال تھا۔ "ابھی اس صورتِ حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا' اس گوشہ میں بھی مجھے محرومی ہی سے دوچار ہونا تھا"

مولانا کی نظر بندی کے احکام کے ساتھ حکومت نے ان کی قیام گاہ کی تلاشی کا حکم نامہ بھی جاری کیا تھا اور جس قدر کاغذات ہاتھ لگے افسران نے قبضہ میں کر لئے انہی میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ شامل تھا۔ جب معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابلِ اعتراض اور حکومت کے مفید مقصد میں نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد کاغذات واپس کر دیئے گئے۔

لیکن جب تفتیش کے نتیجے سے حکومتِ ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ حکومتِ ہند کا خیال تھا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس کرنے میں جلدبازی کی اور بہت ممکن ہے کہ پوری طرح معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ مولانا کا کہنا ہے "اس زمانے میں حکومتِ ہند کے محکمہ تفتیش کا افسر اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ تھا اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں اسے میری مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا اور پھر رانچی آیا اور از سرِ نو میرے مکان کی تلاشی لی گئی' تلاشی کے بعد کہا گیا کہ جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لئے گئے تھے اب حکومتِ ہند کے معائنے کے لئے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات اور چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسوّدہ تھا بلکہ بعض دوسری مصنّفات کے بھی نامکمل مسوّدات تھے"

مولانا فرماتے ہیں:۔

"جس وقت یہ معاملہ پیش آیا' ترجمہ کا مسوّدہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسوّدہ سورہ نساء تک پہنچ چکا تھا لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضہ میں نہ تھا۔ تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی اور 1918ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتداء کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل تھا"

مولانا نے کاغذات کی واپسی کے لئے حکومت سے سلسلہ جنبانی کی لیکن حکومت انہیں واپس کرنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی نہ ہی مستقبل میں انکی واپسی کی اُمید تھی چنانچہ مولانا نے یہی مناسب خیال کیا کہ از سرِ نو

ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کر لی جائے۔ مولانا رقمطراز ہیں:۔ "یہ کام آسان نہ تھا' ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے' تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سرِنو مکمل کر لیا"

"گفتہ" گر شد ز کفم شکر کہ "ناگفتہ" بجاست
از دو صد گنج' یکے مُشتِ گُہر باختہ ام!

مولانا نے مسوّدہ کو بہتر حالت میں مرتّب کرانے کی خاطر اسے اردو ٹائپ کرایا اور دسمبر 1919ء میں یہ نصف سے زیادہ ٹائپ ہو گیا۔ انہی ایّام میں حکومت نے مولانا کو رہا کر دیا۔ جب مولانا رہا ہوئے تو ملک کی سیاسی فضا کے تقاضوں کے پیشِ نظر تحریک عدم تعاون کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے اور عرصہ تک دوسری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔

مولانا رقمطراز ہیں:۔

"1921ء میں جب ملک کے ہر گوشے سے ترجمان القرآن کے لئے تقاضہ شروع ہوا' تو مجھے اس کی اشاعت کے لئے آمادہ ہو جانا پڑا۔ چونکہ ٹائپ کی چھپائی اس کے لئے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی اس لئے کتابت کا انتظام کیا گیا...... نومبر 1921ء میں متن کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی...... لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی میرے خلاف تھا"

یہ تو تھی حکومت کی تجاویزات کی داستان' اس کا باقی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا اور عمّالِ حکومت کی چیرہ دستیوں کا پردہ چاک کیا جائے گا کہ انہوں نے مولانا کی رہائش گاہ اور مطبع کی تلاشی لیتے وقت کیسی بدذوقی کا مظاہرہ کیا۔ جس سے قیمتی مسوّدات اور یادداشتیں ضائع ہو گئیں اور مولانا کے باذوق پرستار اور عقیدت مندان کے عجائبات فکر سے محروم ہو گئے۔ حکومت کی ناانصافی اور ظلم پر ماتم کے ساتھ ساتھ جناب فضل الدین احمد سے شدید گلہ ہے۔ ان کے اصرار و استدعا پر "تذکرہ" عالمِ وجود میں آیا۔ لیکن انہوں نے ظلم یہ کیا۔ ظلم اس لئے کہا ہے کہ شارحین نے ظلم کے معنی "وضع الشیٔ فی غیرِ موضعہٖ" کئے ہیں۔ یعنی شۓ کا اصلی جگہ پر نہ ہونا' بے موقع اور بے محل ہونا۔ اس حالت کو عربی لغت میں ظلم کہتے ہیں۔ فضل الدین احمد "تذکرہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"...... (مولانا) جابجا فٹ نوٹ شروع کر دیتے تھے اور وہ بیس بیس پچیّس پچیّس صفحوں تک چلے جاتے تھے۔ مجبوراً میں نے چار مقام سے تین فصلیں اور چار بڑے فٹ نوٹ نکال دیئے...... یہ فصلیں اور حواشی نکالے گئے' سب محفوظ ہیں' اور بجائے خود مستقل مضمون کا حکم ہیں۔ انشاءاللہ انکو بھی کسی نہ کسی عنوان سے عنقریب شائع کر دوں گا"

جناب فضل الدین احمد نے اختصار کے نام پر "تذکرہ" کی غیر معمولی ضخامت کو کم کرنے کے بہانے مولانا کے رشحاتِ قلم' جو کئی صفحات پر محیط تھے' روک لئے' ان کا اعتذار لائقِ اعتنا ہے' لیکن انہوں

نے ان صفحات کو عنقریب شائع کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان کے اعتراف کے مطابق یہ ''خود مستقل مضمون کا حکم'' رکھتے تھے۔ مولانا کے پرستاروں کو ان سے محروم بنانے کی ذمہ داری ایک ایسے شخص پر ہے جو اس امر کے دعوے دار ہیں کہ ان کے دل میں مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کی قدر و منزلت دوسروں سے دوچند ہے۔ ان کے دعوٰے سے اختلاف نہیں۔ انہوں نے مولانا سے ''تذکرہ'' لکھوا کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مولانا کے پرستاران کے منت کشِ احسان ہیں۔ اس کے ساتھ گلہ مندی اور شکوہ سنجی کا بھی حق رکھتے ہیں۔ مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کا ضیاع معمولی نقصان تو نہیں یہ اوراق قوم کا گراں قدر سرمایہ تھے اس کے کسی حصہ' پہلو یا گوشہ کا زیاں ناقابلِ تلافی خسارہ ہے۔ اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

''تذکرہ'' کے اصل مسودہ میں دوسرا باب حضرت شیخ محمد بن شیخ جمال دینؒ کے حالات میں تھا اور مولانا نے اس پر اپنے والد مرحوم کے مادّی سلسلہ کا حال ختم کر دیا تھا۔ تیسرے باب میں ان کے جدِ امجد حضرت شاہ محمد افضلؒ کے حالات تھے اور پھر مولانا منور الدینؒ کے' اس کا اعتراف جناب فضل الدین احمد نے ''تذکرہ'' کے صفحہ 286 پر ایک نوٹ میں کیا ہے۔ دستیاب ''تذکرہ'' میں مولانا نے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کے حالات اور اپنی سوانح عمری کو اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے' اور اس کی ابتدا حضرت مولانا جمال دین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی سے کی ہے جو بہ دو واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے۔ دہلی میں رہتے تھے اور درس علوم نقلیہ و عقلیہ میں استادِ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و طریقت کا سلسلہ بھی ان سے قائم تھا۔ جب بعض علمائے عصر نے اکبر کے امامِ وقت ہونے کا محضر تیار کیا اور تمام علمائے دارالحکومت نے اس پر مہریں کیں' تو وہ محضر دہلی میں بھی آیا اور ان سے تصدیق و امضاء کے لئے کہا گیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس قدر ہو چکا کافی ہے' ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی ہے؟...... جب حالات روز بروز مخدوش ہونے لگے تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا' اور اپنے تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ چلے گئے''

مولانا فرماتے ہیں۔ ''حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ جمالدین اور شیخ داؤدؒ کے علم و عمل اور بزرگی و تقدّس کے جو شواہد تاریخ میں موجود ہیں' اگر ان میں ایک بھی ہمارے سامنے نہ ہوتا' اور صرف اتنا ہی معلوم ہوتا کہ انہوں نے مخدوم الملک کی مخالفت اور شیخ نیازی و شیخ علائی کی حمایت کی تھی اور میر محمد جونپوری کی توصیف و توثیق میں علانیہ ایک کتاب لکھی تھی' تو ان کی بڑی سے بڑی بزرگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ عظمتِ حقانی و عزت جاودانی کے لئے صرف یہی ایک واقعہ بس کرتا تھا''

''تذکرہ'' میں محضر امامتِ شہنشاہِ اکبر' دربارِ اکبری کے فتنہ پرداز دین فروش اور متعصب عالم دین مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری اور صدر الصدور عبدالنّبی کی قہرمانیاں' ملّا مبارک کے خاندان کی جدیدیت و اجتہاد' شیخ محمد داؤد' سیّد محمد جونپوری' شیخ عبداللہ نیازی' شیخ نیاز علائی کے زہد و تقویٰ اور ورع شیخ

بڈھ کے کتمانِ حق اور حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مذہبی عقائد و مسالک اور سرگرمیاں مذکور ہیں۔ علاوہ بریں امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام مالکؒ، امام ذہبیؒ، حافظ عسقلانی، امام ابو حیان، شیخ واسطی، شیخ ابو حفص ابزار بغدادی اور دیگر علماء کے فکر و نظر پر بڑے ہی عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور جس دل نشین پیرائے میں بیان کیا ہے اگرچہ زبان و بیان عربی ادب، اقوال، احادیث اور قرآنی آیات سے عبارت مزیّن ہے لیکن اس سے عام قاری کی لذت آفرینی مجروح نہیں ہوتی بلکہ لطف اندوزی دوبالا ہوتی ہے۔ مضامین ادّق ہیں لیکن عبرت انگیز و سبق آموز ہیں۔ مولانا بلاشبہ شہ دماغ تھے۔ انہوں نے تذکرہ میں ایک محقق، ایک مؤرخ، ایک عالم، ایک فاضل، ایک ادیب، ایک خطیب کے انداز میں جادو جگایا ہے۔ یہ مجموعہ غریب الوطنی میں محض حافظہ کے اعتماد اور یادداشت کے اعتبار کا شاہکار ہے۔ "تذکرہ" کے آخر میں لکھتے ہیں:۔ "یہ اوراقِ پریشان کہ دوست عزیز مسٹر فضل الدین احمد کے بے حد اصرار سے قلم بند ہوئے، اپنی پریشانیٔ طبع و برہمیٔ خاطر کی یادگار ہیں۔ اگرچہ کئی بار قصد کیا مگر جمعیتِ خاطر کا وقت ان کے لئے بہم نہ ہوسکا۔ ابتدا سے اب تک یہ حالت رہی ہے کہ جب کبھی اپنے ضروری اشغال سے کچھ وقت بچا، چند اجزاء لکھ ڈالے اور عزیز موصوف کو بھیج دیئے، نہ پورا سلسلہ سامنے رہا نہ ربط و ترتیب اور تقسیم و تبویب کی مہلت ملی کہ شیوۂ اصحابِ تصنیف و تدوین ہے۔ تمام کتابیں کلکتہ میں پڑی ہیں۔ بجز اپنے قلمی مسوّدات اور ایک نسخہ مصحف کے اور کوئی کتاب ہمراہ نہیں۔ جب یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا تو بعض حالات کے لئے تذکرۃ الواصلین، اخبار الاخیار اور طبقاتِ اکبری منگوالی، اور بعد کو منتخب التواریخ بھی آ گئی۔ ان کے سوا کوئی کتاب پیش نظر نہیں رہی۔ جو کچھ لکھا ہے، صرف اپنے حافظہ کے اعتماد پر لکھا ہے۔"

آغا شورش کاشمیری نے اپنی زندگی کی آخری ضخیم تصنیف "ابوالکلام آزاد، سوانح و افکار" میں "تذکرہ" کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "تذکرہ" حقیقتاً کئی مباحث کا مخزن ہے اس کی مثال ایک ایسی جھیل کی سی ہے جس میں کئی چشمے اکٹھے ہوں۔ یوں کہئے کہ ایک چمنستان ہے جس میں طرح طرح کے پھول، کلیاں، شاخیں، قطعے اور روشیں سرسبز نظر آتی ہیں۔ مشکل اور دقیق مسائل، تاویلِ حق و تاویل باطل، تکفیر و تفلیل، قتل و سلب، تطبیق عقل و نقل، فتنۂ حیل و احتیال، قیاسِ صالح و غیر صالح، احیاء و تجدیدِ امّت، نفس امّارہ، لوّامہ و مطمئنہ، منکرینِ وحی کے شکوک و شبہات، علمائے سو کی اسلام میں پیوند کاریاں، فتنہ طرازیاں، حق پرستوں کی استقامت، عزیمت اور دعوت عزیمت وغیرہ موضوعات پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ مقامِ "عزیمتِ دعوت" اور "احیاء و تجدیدِ اُمّت" کی نسبت جو کچھ بلا مقصد زبان قلم پر آ گیا۔ اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہ تھا، لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہوا کہ شاید ان حالات و وقائع کا مطالعہ اصحابِ صلاح و استعداد کے لئے کچھ سود مند علم و عمل ہو۔"

پروفیسر محمد مجیب چانسلر جامع ملّیہ دہلی "تذکرہ" کے بارے میں اپنے ایک انگریزی مقالہ میں لکھتے ہیں:۔

"تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جاسکتا ہے اِس کی حیثیت ایک کتاب سے زیادہ ہے۔ وہ ایک اشاریہ ہے ایک شخصیت ہے ایک شعلہ اور ایک جوش ہے۔ ایک الہامی آواز کی قوتِ نطق 'ایک بڑے دل کا گریہ وبکا' ایک المیہّ کا محزون نغمہ اور ایک فتح کا مسرت انگیز زمزمہ ہے' وہ ایک ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصوّر کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصوّر جو فطرتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔"

اسی مقالہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ غیر محدود آمد ہی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا مؤثر بیان اور مذہبی و اخلاقی مسائل کا پرجوش مذاکرہ بنادیا ہے۔ اس سے مولانا کی شخصیّت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ تذکرہ موضوع نہیں ہے۔ حمایتِ حق ہے۔ جس کی تکمیل کے لئے متبحّر علم وفضل 'الفاظ پُرزور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے"

الغرض یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ رانچی میں نظر بندی کے دوران میں "تذکرہ" ہی ایسی تصنیف ہے جو نسبتاً مکمل صورت میں شائع ہوسکی یا جسے کسی حد تک مکمل کتاب کا نام دیا جاسکتا ہے باقی سب کچھ امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ مولانا نے سیرت حضرت مجدد الف ثانیؒ متوسط تقطیع کے 173 صفحات پر صرف ایک ہفتہ میں لکھ دی تھی۔

گرفتاری کے لئے غیر معمولی انتظامات

مولانا کی نظر بندی کے لئے غیر معمولی انتظامات کئے گئے تھے اور فوجی شان وشوکت اور قوت کی نمائش کی گئی۔ رات کے پچھلے پہر تین بجے کے قریب پولیس کے افسران اور سپاہیوں کی مسلح گارد ڈپٹی کمشنر کی معیّت میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچی۔ جس میں سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی' سپرنٹنڈنٹ و ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو انسپکٹر بھی شامل تھے۔ سب انسپکٹر کے سوا سب کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ سپاہیوں نے پہلے دور تک سڑک کی ناکہ بندی کی پھر مکان کو محاصرہ میں لے کر دروازہ پر دستک دی۔

آزادی سے دوسری مرتبہ محرومی و سزا

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء

گورنمنٹ بنگال نہیں چاہتی تھی کہ مولانا کو گرفتار کر کے امن وامان کا مسئلہ پیدا کرے اور تحریک میں نئی جان پیدا ہو۔ گورنمنٹ کا خیال تھا کہ مولانا بدایوں کے جلسہ جمعیت العلماء میں شرکت کے لئے کلکتہ سے باہر جائیں گے لہٰذا انہیں گرفتار نہ کیا جائے اگرچہ ان کی اور سی۔آر۔ داس کی گرفتاری کی افواہیں 2ر دسمبر سے گردش کر رہی تھیں۔ 9ر دسمبر تک مولانا بدایوں روانہ نہ ہوئے تو ان کی روانگی کی آخری اُمید بھی ختم ہو گئی کیونکہ 10 اور 11 تاریخوں کے جلسہ میں شمولیت کے لئے 9 کی شام تک روانگی لازمی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں ”گورنمنٹ کی تمام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی میری خواہش سے متضاد ہے اور میرا موجودہ فرض تعمیل نہیں بلکہ خلاف ورزی ہے“ گرفتاریاں روزانہ ہو رہی تھیں۔ گورنمنٹ نے مولانا کی گرفتاری کا بھی فیصلہ کیا۔انہیں حکومت کے فیصلہ کی اطلاع پہنچی تو اس پر بڑے مسرور تھے۔ان کا کہنا ہے۔ ”اس فیصلہ نے مجھے ایک بڑے بوجھ سے نجات دلا دی‘ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لئے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔“

”پیچھے رہ جانے والوں پر کیا گزرتی ہے“ اس کیفیت کا اظہار مولانا نے بریڈلا ہال لاہور میں جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس 18‘20 نومبر 1921ء کے صدارتی خطبہ میں کیا ہے فرماتے ہیں!

"خدارا ابتلائے میں اپنے خوں چکاں زخموں کا مرہم کہاں ڈھونڈوں ؟ کون ہے جو اس درد وغم کا لذت شناس ہو سکتا ہے ؟ جس کو برسوں سے میں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں ؟ جب سوچتا ہوں کہ ہمرہانِ طریق آج قید خانوں میں اسیر ہیں اور میں نامراد جلسوں کی صدارتیں کرتا پھرتا ہوں تو یقین کیجئے کہ مجھے اپنی زندگی اور نام نہاد آزادی سے وحشت آنے لگتی ہے۔ میں لفظوں اور صداؤں میں اس درد وغم کی کشمکش ظاہر نہیں کر سکتا جس سے میرا سینہ شق ہونے لگتا ہے۔ اگر احادیث میں روکا نہ گیا ہوتا کہ مومن کو ابتلاء کی تمنا نہیں کرنی چاہئے تو یقین کیجئے کہ میں اس آزادی سے اس قدر اکتا گیا ہوں کہ قید و بند کی آرزوئیں کرتا اور اس کے لئے خدا سے دعائیں مانگتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قطع نظر ایّامِ گزشتہ کے پچھلے دو ماہ کے اندر میں اپنی جانب سے بار بار معاملہ کو انتہا تک پہنچا چکا ہوں، مگر نہیں معلوم کیا بات ہے، ساری دنیا گرفتار کی جاچکی ہے، مگر مجھ مشتاق کے نام کوئی پیغام نہیں آتا۔"

9 ر دسمبر کو مولانا اور مسٹر سی۔آر۔داس نے آئندہ کام اور پروگرام کو آخری شکل دی اور طے پایا کہ اگر وہ دونوں بیک وقت گرفتار کر لئے جائیں تو مسٹر شیام سندر چکرورتی ان کی جگہ کام کے نگران ہوں گے اور ان کی گرفتاری کی صورت میں یکے بعد دیگرے ذمہ داری سنبھالنے والوں کی فہرست تیار کر دی۔

10 ر دسمبر بعد سہ پہر کو چار بجے مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر سپیشل برانچ ایک یورپین انسپکٹر پولیس کے ہمراہ مولانا کی قیام گاہ پر آئے اور ان کا دریافت کیا۔ مولانا اوپر کی منزل میں تشریف فرما تھے انہیں صورت حال کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے مسٹر گولڈی کو اوپر بلوالیا۔ مسٹر گولڈی نے آمد کا مقصد بتایا اور انہیں ہمراہ چلنے کی استدعا کی۔ مولانا نے استفسار کیا کہ کیا آپ کے پاس وارنٹ گرفتاری ہیں۔ گولڈی نے جواب نفی میں دیا مگر مولانا نے ردّ و کد نہیں کیا اور کہا کہ وہ بلا وارنٹ بھی چلنے کو تیار ہیں۔ وہ چند منٹوں میں تیار ہو گئے۔ انسپکٹر نے کہا کہ اس قدر جلدی نہ کیجئے اپنا سامان ساتھ لے لیجئے لیکن انہوں نے صرف ایک چادر اوڑھی۔ اس مرتبہ گرفتاری کے لئے خاص اہتمام حکومت نے نہیں کیا صرف دو آدمی بلا وردی عام ملاقاتیوں کی طرح آئے اور تمام کارروائی خاموشی سے ہوئی۔ پولیس اور فوج کی نمائش نہیں کی گئی۔ مولانا کی رہائش گاہ تھانہ سے بالکل ملحق تھی وہاں بھی غیر معمولی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ کیونکہ حکومت سمجھ چکی تھی کہ قوت کی غیر معمولی نمائش سے عوام کا اژدھام ہو جاتا ہے اس سے پولیس کو کارروائی کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں سیاسی اصحاب گرفتاری کی پیش کش خود کرتے ہیں ان کا مقصد حکومت کو خوفزدہ اور عوام کو خوش کرنا نہیں ہوتا۔

مولانا کو پولیس کمشنر کے دفتر پہنچایا گیا چند منٹوں کے بعد مسٹر سی۔ آر۔ داس بھی گرفتار کر کے وہاں لائے گئے بعد میں دونوں رہنماؤں کو علی پور جیل میں پہنچا دیا گیا۔ مولانا نے مغرب کی نماز جیل کے

دفتر میں ادا کی اور جیل کے یورپین وارڈ میں پہنچا دیئے گئے جہاں صرف انڈر ٹرائیل یورپین رکھے جاتے تھے۔ اس دو منزلہ عمارت کے اوپر نیچے پانچ پانچ کمرے ہیں۔ ہر کمرہ دس فٹ طول و عرض کا ہے۔ جس میں ایک صراحی 'ایک تام چینی کا کٹورا 'ایک سٹول اور ایک ٹیبل تھا۔ سونے کے لئے ٹاٹ کی گدیلی اور دو کالے کمبل تھے۔ تکیہ کی جگہ ٹاٹ کی ایک پتلی اور چھوٹی سی گدیلی سرہانے لگی ہوئی تھی۔ موجودہ دور کے سیاسی قیدیوں کے لئے غور اور توجہ کا مقام ہے کہ ابوالکلام آزاد جیسے بالاسطح کے عظیم رہنما کو جیل میں کس حالت میں رہنا پڑتا تھا؟ آج کے سی کلاس کے سیاسی قیدیوں کو اس سے زیادہ سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اکابرینِ قوم اور زعمائے ملّت نے آزادی کا عظیم مقصد حاصل کرنے کے لئے کتنی مصیبتیں برداشت کیں، کتنے دُکھ اٹھائے، کتنی تکالیف کا سامنا کیا جب کہیں آزادی کا آفتاب طلوع ہوا کہ

خونِ صدر ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

1921ء میں جب مولانا گرفتار ہوئے تو قید خانے میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔ مولانا اس سے آگاہ تھے۔ انہوں نے سگریٹ نوشی کے ترک و اختیار کا واقعہ 3 اگست 1942ء کے مکتوب میں لکھا ہے: ۔

> "1921ء میں جب گرفتار کیا گیا' تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانے میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر پہلے ہاتھ بڑھایا کہ اسے جیب میں رکھ لوں' پھر صورتِ حال کا احساس ہوا تو رُک گیا۔ لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لیکر آیا تھا' یہ اصرار کیا کہ ضرور جیب میں رکھ لو میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگریٹ تھے۔ ایک پولیس کمشنر کے آفس میں پیا۔ دوسرا راستہ میں سلگایا۔ دو ساتھیوں کو پیش کئے۔ چھ باقی رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر میں جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا' اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگریٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا' اور پھر اس دن سے لیکر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس سگریٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قید خانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض شُربِ الیہودؔ کا طریقہ کام میں لاتے تھے:
>
> شُربِ الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم
>
> بعضوں کی جراُتِ رندانہ اس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی وہ:

اسلامی حکومتوں میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے اس لئے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں "شراب الیہود" کی اصطلاح رائج ہو گئی۔

ولا تسقنی سراً فقد امکن الجہرؔ !

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبہ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہوا کئی مرتبہ گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیئے۔

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد!

سرگزشت کا اصلی واقعہ اب سنئے۔ جس دن علی الصباح مجھے رہا کیا گیا تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کی۔ یقین کیجئے جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا' اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول بھی کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا نہ حصول پر نشاط۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزہ دیا تھا' وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ صافی و دُردی نۂ' خطا ایں جاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی' بلا ایں جاست!

1921ء کے بعد پھر تینؔ مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔"

مولانا کو جس وارڈ میں رکھا گیا وہاں "پیغام" کلکتہ کے مدیر مولوی عبدالرزاق' بابو پدم راج جین' مسٹر داس کے فرزند اور کئی دیگر سیاسی قیدی پہلے سے موجود تھے۔ جنہیں اگلے روز دوسرے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ حکومت نے مولانا کے خلاف دو مقدمات قائم کئے:۔

(ا) زیرِ دفعہ 17۔ 2 ترمیم ضابطۂ فوجداری

(ب) زیرِ دفعہ 124۔ الف تعزیراتِ ہند

پہلا مقدمہ حکومت نے واپس لے لیا۔ دوسرا مقدمہ مولانا کے خلاف دو تقاریر کی بنا پر قائم کیا گیا جو انہوں نے مرزا پور پارک میں یکم اور پندرہ جولائی کے عام جلسوں میں کی تھیں۔ یہ جلسے حکیم سعید الرحمان' جگدما پرشاد اور اجودھیا پرشاد کی گرفتاری اور سزایابی کے خلاف صدائے احتجاج بلند

.....پورا شعر یہ ہے

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمر۔ ولا تسقنی سراً فقد امکن الجھد

"مجھے شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے مجھے چھپا کر نہ پلا کیونکہ اب کھل کر پینا ممکن ہو گیا ہے۔

فٹ نوٹ مولانا ۱۹۲۱ء کے بعد چار مرتبہ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۳۰ء' ۱۹۳۲ء' ۱۹۴۱ء' اور ۱۹۴۲ء مؤلف۔

کرنے کے لئے منعقد ہوئے تھے۔ مولانا نے تقریر کرتے ہوئے حکومت کی چیرہ دستیوں اور خلافتِ اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر روشنی ڈالی اور عوام کو حکومت سے تعاون ترک کرنے کی تلقین کی جسے حکومت نے بغاوت سے تعبیر کیا اور مولانا پر مقدمہ قائم کر دیا۔

استغاثہ نے عدالت کے روبرو اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ مقرر نے اپنی تقریروں سے گورنمنٹ قائم شدہ بروئے قانون کے خلاف لوگوں میں حقارت اور نفرت پھیلانے کی کوشش کی' اور اس طرح ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا جس کی بنا پر 124۔ الف تعزیراتِ ہند کے ماتحت سزا کا مستوجب قرار پا سکتا ہے۔

گورنر ان کونسل نے مدعی کو یہ حکم اور اختیار دیا ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو زیرِ دفعہ 124۔ الف تعزیرات ہند گرفتار کرے اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرے۔ للہذا مدعی درخواست کرتا ہے کہ ملزم کے خلاف حکم نامہ جاری کیا جائے کہ وہ مذکورہ بالا الزامات کی جواب دہی کرے اور اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی عمل میں لائی جائے۔

مولانا نے گرفتاری کے وقت تمام احباب اور قومی کارکنوں کو ایک پیغام دیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں پوری مستعدی کے ساتھ مشغول رہیں مجھ سے ملنے کے لئے کوئی شخص نہ آئے نہ اپنی جگہ اور اپنے کام کو چھوڑے۔ گرفتاریوں کو ایک معمولی اور متوقع واقعہ کی طرح محسوس کرنا چاہئے۔ کسی طرح خلافِ معمول اہمیت نہ دی جائے۔ مجھے بڑا ہی رنج ہو گا' اگر کسی نے میری ملاقات کے لئے اپنا ایک گھنٹہ بھی ضائع کیا۔

مولانا نے اپنے پیغام میں جو ہدایت جاری کی اور امید دلائی تھی اس کا عوام پر بڑا اچھا اثر ہوا اور لوگ اپنے کام میں پوری تندہی سے منہمک ہو گئے' مولانا کا بیان دلِ دردمند کی پکار تھی۔ انہوں نے کہا:۔

"انتظار کی رات بڑی تاریک تھی لیکن امید کی صبح بھی کیسی دل فریب اور جانفزا ہے۔ افسوس ان پر جواب بھی کروٹ نہ لیں۔ آؤ غفلت کا بستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہِ مقصد میں آخری کوچ کریں۔ راستہ صاف اور منزل سامنے نظر آ رہی ہے۔ ہمت' صبر' قربانی استقامت کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا۔

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا   اب لیا چشمۂ بقا تو نے

اصبرو و اصابرو و رابطو العلکم تغلعون

فقیر ابوالکلام

10 دسمبر 1921ء

لوگ واقعی اپنے کام میں لگ گئے گرفتاریوں میں شدت آ گئی۔ مظاہروں نے زور پکڑ لیا۔ جلسے جلوس میں اضافہ ہو گیا الغرض ملک آتش فشاں بن گیا۔ حکومت کا رویہ جس قدر سخت اور شدید ہوتا جاتا تھا۔

عوام کے جوش و خروش اور ولولے اسی نسبت سے جوان ہونے جاتے تھے۔ عوام حکومت کے جبر و تشدد کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ 15، دسمبر 1921ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مدیر "پیغام" کلکتہ کو دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ 19 دسمبر کو کلکتہ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مولوی عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ کلکتہ پریسیڈنسی میں کالج کے طالب علموں نے حکومت کے جبر و استبداد کے خلاف ایک ہفتہ تک مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلکتہ کے دس ہزار مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ 24 دسمبر 1921ء کو پرنس آف ویلز کی کلکتہ آمد پر عوام نے مکمل بائیکاٹ کیا۔ شہر میں ہُو کا عالم تھا۔ 22 دسمبر کو پرنس آف ویلز کی آمد سے دو یوم قبل 253 گرفتاریاں ہوئیں۔ 8 جنوری 1922ء کو والینٹروں کی بھرتی روکنے کے لئے حکّام نے دھاوا بول دیا۔ اس کا الٹا اثر ہوا' عوام خوفزدہ ہونے کی بجائے دھڑا دھڑ اپنا نام والنٹیروں میں لکھوانے لگے۔ ولنگٹن اسکوائر کلکتہ میں عوام کا ہجوم ہو گیا۔ چار سو رضا کاروں نے جلوس نکالا 169 گرفتار کر لئے گئے۔ 22 دسمبر کو مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی گرفتار ہوئے۔

یہ تو تھے کلکتہ کے احوال 'اب دوسری جگہوں کے چیدہ چیدہ اور اہم واقعات کا تذکرہ بھی ہو جائے۔

22 دسمبر 1921ء کو لالہ روپ لال سیکرٹری کانگریس کمیٹی امرتسر شہر کو چھ ماہ قید سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ 4 جنوری 1922ء کو 24 رضا کاروں کا ایک دستہ پنڈت پریم پرکاش اور ماسٹر دیا رام کی قیادت میں نعرے لگاتا ہوا امرتسر شہر کی سڑکوں پر گشت کر رہا تھا۔ پولیس اور گورکھا فوج کا ایک دستہ اسلحہ سے لیس ان کے تعاقب میں آیا اِنہیں بڑی بے دردی سے زد و کوب کیا۔ کئی کو شدید ضربات آئیں۔ پنڈت پریم پرکاش شدید مضروب ہوئے اور بے ہوش ہو گئے مگر رضا کاروں نے نعرہ بازی جاری رکھی۔

نوعمر بچے گشت کرتے تھے اور پولیس ان کا تعاقب کر کے پیٹتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی کی صرف ایک لڑکی تھی۔ ان کی بیگم اور صاحبزادی جلسوں میں شریک ہوتی تھیں ان کی تقلید میں بے شمار مسلمان عورتوں نے تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ سیّد برجیس سیکرٹری کانگریس کمیٹی فیروزپور پر مقدمہ قائم ہوا۔ لاہور میں رضا کاروں نے منتشر ہونے سے انکار کیا تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ردِّعمل میں عوام نے قانون شکنی شروع کر دی۔ 22 دسمبر 1921ء کو لالہ بدری ناتھ مدیر روزنامہ "سوراج" لاہور کو بغاوت کے مقدمہ میں تین سال قید با مشقت کی سزا سناتے ہوئے انتہائی اہانت آمیز الفاظ کہے کہ ملزم دیوانے کتے کی مانند ہے۔ اسے زہر پھیلانے سے قید کے سوا کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ 25 دسمبر 1921ء کو مولانا مرتضےٰ خان میکش کو گرفتار کر لیا گیا۔ 26 دسمبر 1921ء کو مولانا حبیب الرحمان کو صبح آٹھ بجے ان کی رہائش گاہ لدھیانہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ انکی گرفتاری کے لئے ڈپٹی کمشنر خود آیا تھا۔ مولانا نے موٹر گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اصرار کر کے ہتھکڑی پہنی۔

20 دسمبر 1921ء کو الہ آباد کے روزنامہ "انڈی پینڈنٹ" کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر

لی گئی اس روز پنڈت مدن موہن مالویہ کے بھانجے شری کرشن کانت مالوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ پرنس آف ویلز کی آمد سے قبل پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس طرح الہ آباد میں احتجاجی ہڑتال نہیں ہو گی لیکن وہاں ایسی کامیاب ہڑتال ہوئی کہ چشم فلک نے کبھی اس کا نظارہ نہ کیا ہو گا۔ اس پر لاہور کے مشہور اخبار روزنامہ "زمیندار" نے مقالہ افتتاحیہ لکھتے ہوئے اہل الہ آباد کے ولولے کا ذکر کیا ہے:۔

"پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے دن سے تحریک کو بیش از بیش تقویت حاصل ہوئی ہے۔ مقامی کانگریس کے دفتر میں عرضیوں پر عرضیاں چلی آ رہی ہیں اور شہر کے باشندے رضا کاروں میں بھرتی ہونے کے لئے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ شہزادہ ویلز کی تشریف آوری کے دن بغیر کہے ایسی مکمل ہڑتال ہوئی کہ الہ آباد کے آسمان نے آج تک نہ دیکھی ہو گی"

حکومت کے کئی افسران بد مزاج، متکبر اور حالات کا ادراک کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سختی کرنے سے لوگوں کے جذبہ حریت کو کچلا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے عوام کے جذبوں کو چیلنج کرنا شروع کر رکھا تھا۔ لاہور میں پچاس گریجویٹس نے گرفتاری دی تو کلکٹر نے متکبرانہ انداز میں حکم دیا کہ لے جاؤ انہیں جیل میں، کلکٹر کا وہم تھا کہ اگلے روز کوئی ہمت نہ کرے گا دوسرے روز بھی پچاس گریجویٹوں نے گرفتاری دی کلکٹر نے انہیں بھی جیل بھجوا دیا تیسرے دن پھر پچاس گریجویٹس کو دیکھ کر کلکٹر کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ چوتھے دن پھر پچاس گریجویٹس نے رضا کارانہ گرفتاری پیش کر کے کلکٹر کے چھکے چھڑا دیئے اور وہ کہنے لگا:۔

'India is making a sacrifice and if India goes on making this sacrifice, we shall have no objection in leaving India.'

(ترجمہ) ہندوستان قربانی دے رہا ہے اور اگر ہندوستان اسی انداز میں قربانی پیش کرتا رہا تو ہمیں ہندوستان سے رخصت ہونے پر کوئی انکار نہ ہو گا"

ملزموں کے کٹہرے میں

مولانا کو دس دسمبر کو گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا تھا، حالانکہ قانون کے مطابق انہیں گرفتاری کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کسی عدالت کے روبرو پیش کرنا ضروری تھا اور عدالت کے حکم کے بغیر جیل بھیج دینا بالکل خلاف قانون تھا لیکن حکومت بوکھلائی ہوئی تھی۔ 13 ردسمبر کو گرفتاری کے چار یوم بعد ملزموں کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور وہ بھی جیل کے اندر، مجسٹریٹ کو جیل میں لایا گیا۔ ٹوٹی پھوٹی میز اور کرسی

مجسٹریٹ کیلئے رکھی گئی اور ملزموں کیلئے اسٹول تھے اس بے سروسامانی میں عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا' مجسٹریٹ نے نہایت مختصر کلمات کہے 'گرفتاری کی دفعہ 17 بتائی اور آئندہ پیشی 23ر دسمبر کا حکم سنا کر عدالت کا اجلاس برخاست کر دیا۔ پیش کار نے قانون کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ حسبِ قاعدہ ملزموں سے ضمانت کیلئے پوچھ لیجئے۔ مجسٹریٹ نے گھبراہٹ کے انداز میں جواب دیا۔ "یہ حضرات ضمانت نہیں دیں گے اِس لئے میں نے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ "مجسٹریٹ نے تو خفت مٹانے کیلئے کہا تھا' درحقیقت فیصلہ یہی تھا کہ اگر ضابطۂ فوجداری میں عدمِ تعاون کے ملزموں سے ضمانت پر رہا ہونے کو کہا جائے تو وہ ضمانت داخل کرنے سے انکار کر دیں اور مزید قید کو ترجیح دیں۔ 23ر دسمبر کو مجسٹریٹ پھر جیل میں آئے' سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں عدالت لگائی اور آئندہ تاریخ سماعت 5ر جنوری 1922ء مقرر کر کے عدالت کی کارروائی ختم کر دی۔ مولانا کو 5ر جنوری کو بھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ کارروائی 6ر جنوری کو ہوئی اس طرح مولانا کو حبسِ بے جا میں بھی رہنا پڑا۔ حکومت کی بے قاعدگیوں اور لاقانونی اقدامات کی داستان بڑی طوالانی اور مضحکہ خیز ہے۔

6ر جنوری کو ساڑھے گیارہ بجے دن مولانا کو پولیس کی بند گاڑی میں بٹھا کر مسلح فوجی کپتان کی نگرانی میں پریذیڈنسی کورٹ لائے' بارہ بجے مقدمہ مسٹر سونیہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کمرہ سے باہر بھی عوام کا زبردست ہجوم تھا۔ مولانا کٹہرے میں آئے تو تمام حاضرین اور وکلاء تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے اس کا جواب خفیف سی مسکراہٹ سے دیا۔ سرکاری وکیل رائے بہادر تارک ناتھ سادھو نے مولانا کیخلاف الزامات پڑھ کر سنائے اور عدالت سے کہا کہ مولانا کے خلاف دو مقدمات ہیں' چونکہ دفعہ 124۔ الف کے تحت مولانا نہایت سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں' لہٰذا پہلا مقدمہ جو زیرِ دفعہ 2/17 ضابطہ فوجداری کی خلاف ورزی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اسے واپس لیا جاتا ہے اور حکومت اس کے تحت کوئی کارروائی کرنیکا ارادہ نہیں رکھتی' لہٰذا مولانا اس دفعہ کے ماتحت آزاد ہیں۔

مقدمہ کی سماعت 9ر فروری 1922ء تک جاری رہی۔ 24ر جنوری کو مولانا نے طویل تحریری بیان عدالت میں داخل کیا جو بعد میں "قولِ فیصل" کے نام سے شائع ہوا' یہ بیان بڑا ہی ولولہ انگیز' معلومات افزاء' پُرجوش خطابت کا مرقع' برطانوی استعمار کیخلاف بغاوت' جرأت مندی' استقامت اور دعوتِ عزیمت ہے۔ اس میں حالات کے مختلف پہلوؤں کا بڑی عمیق نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے' ظالم و جابر اور غاصب حکمرانوں کے انجام سے باخبر کیا گیا ہے اعلائے کلمتہ الحق کے واقعات اسلامی تاریخ سے بیان کئے ہیں۔ عدالتوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور حق پرستوں کے ساتھ عدالت کے سلوک کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس سیاسی مرقع کو ادبی چاشنی نے مزید لذت آفرین بنا دیا ہے' یہ مولانا کے وسعتِ نظر' فکری کمالات اور مطالعہ کی جولاں گاہ کا شاہد ہے' تاریخ' سیاست اور ادب کے طالبعلموں کیلئے بڑی کار آمد اور مفید

دستاویز ہے اس کے مطالعہ کے بغیر سیاست کے طالبعلم کا علم و مطالعہ ناقص ہے۔

مولانا بیان دینے کے مکلّف نہ تھے' عدالتی کارروائی میں حصہ لینا' اپنا دفاع پیش کرنا اور بے گناہی کا ثبوت دینا عدمِ تعاون کی روح کے منافی تھا' لیکن مولانا کو کانگریس' خلافت اور جمعیت نے اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دیدیا تھا۔ یہ فیصلہ سیاسی اعتبار سے بڑا ہی صائب اور بروقت تھا' بصورت دیگر قوم اس گراں قدر علمی خزینے اور سیاسی تجزیئے سے محروم رہ جاتی اور ناقابلِ تلافی قومی زیاں ہوتا۔ مولانا کے بیان سے تحریک کو بڑی تقویت ملی تھی' عوام کے حوصلوں میں مزید اضافہ ہوا اور ارادے مستحکم ہوئے' یہی ان کا مقصود تھا۔

مولانا کی اہلیہ بڑی باوفا اور نیک طینت عورت تھیں' انہوں نے اپنی تمام خواہشات شوہر کی خوشیوں پر نچھاور کر دی تھیں۔ نہایت عُسرت میں زندگی بسر کی لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا' بلکہ ہر آزمائش کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا۔ مولانا کے ساتھ مکمل تعاون کیا اُن کے کاموں میں کبھی رکاوٹ کھڑی نہ کی' ذاتی آرام و آسائش کا کبھی خیال نہ کیا۔ مولانا کو سزا ہوئی تو انہوں نے کسی پریشانی یا ملال کا اظہار نہیں کیا۔ مولانا کی غیر حاضری کے باعث جو خلا پیدا ہوا تھا' اس سے تحریک کی شدت کو ضعف کا احتمال ہو سکتا تھا۔ لیکن زلیخا بیگم نے آگے بڑھ کر اس خلاء کو پُر کیا اور تحریک کو کوئی گزند نہ پہنچنے دی۔ انہوں نے گاندھی جی کو ایک تار احمد آباد اور باردولی کے پتوں پر بھیجا جسے کلکتہ کے سنٹرل ٹیلی گراف آفس نے روک لیا تھا' تار میں لکھا تھا:۔

"میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا' انہیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی' یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے' جس کے سننے کیلئے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے' یہ تو کم سے کم بھی نہیں' جس کے وہ مستحق تھے' بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے ان کیلئے میں اپنی ناچیز خدمات پیش کرتی ہوں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پائے تھے میرے لئے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے لیکن میں خدا سے مدد کی پوری امید رکھتی ہوں۔ البتہ ان کی جگہ بنگال میں ہی خالی نہیں ہوئی ہے بلکہ تمام ملک میں' اور اس کیلئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے۔

میں پہلے چار سال تک ان کی نظربندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کیلئے وقف کر دینا چاہئے۔ میں آج سے بنگال خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنی بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔"

مولانا اگرچہ جیل میں محبوس تھے' لیکن وہ عوام کے جذبات کی شدت کا پورا ادراک رکھتے تھے اور

انہیں اس قسم کی اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ فیصلہ کے دن عوام رش کریں گے اور شدید ردِّ عمل ظاہر کریں گے۔ انہوں نے قبل از وقت 7 ر فروری کو اخبارات کے ذریعے اعلان کرادیا:

○ 9 ر فروری کو کوئی شخص عدالت کی کارروائی دیکھنے کیلئے نہ آئے 'نہ ہی سڑکوں پر کسی طرح کا ہجوم ہو۔

○ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں سزا کا حکم سنایا جائیگا' عوام کو پورے صبرو سکون کے ساتھ متوقع فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے اس پر کسی طرح کا غیر معمولی مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔

○ عوام اپنی معمول کی روزانہ جدّوجہد جاری رکھیں اور اپنی سرگرمی میں ممکن حد تک اضافہ کریں۔

○ میرے ساتھ اظہارِ محبت وعقیدت کی صرف یہی راہ ہے کہ والنٹیر بن جاؤ اور جیل جانے کیلئے تیار رہو۔ ہڑتال اور مظاہرے نہ صرف اصول کیخلاف ہیں بلکہ مقاصد کیلئے بھی مضر ہیں۔

امر واقع بھی یہی ہے کہ ہڑتال اور مظاہروں کی زبردست تیاریاں تھیں خضر پور ڈک مزدور' ہوٹلوں اور انگریزوں کے بیس ہزار خانسامے ہڑتال کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ڈک مزدور تو قبل ازیں مولانا کی گرفتاری پر ہڑتال کر بھی چکے تھے۔ کانگریس کمیٹی نے انہیں سمجھا بجھا کر کام پر واپس لگایا تھا۔ کالجوں کے طلبہ کے بارے میں بھی ہڑتال کی اطلاعات تھیں۔ مولانا کی اپیل بڑی مؤثر ثابت ہوئی۔ ہڑتال کے فیصلے واپس لے لئے گئے اور 9 فروری کو عدالت اور جیل کے باہر کسی قسم کا ہجوم نہیں ہوا۔ بارہ بجے عدالت نے مولانا کو بلایا اور فیصلہ سنایا۔

ایک سال قید بامشقت

مولانا نے فیصلہ سنکر مجسٹریٹ سے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"یہ تو اس سے بہت کم ہے جس کی مجھے توقع تھی"

عدالت نے فیصلہ میں لکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد زیر دفعہ 124۔ الف تعزیرات ہند مجرم قرار دیئے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے یکم جولائی 1921ء کو مرزاپور اسکوائر کلکتہ میں مسئلہ خلافت' پنجاب اور آزادیٔ وطن کے مضامین نیز پندرہ جولائی کو اسی مقام پر مسئلہ ترکِ موالات وغیرہ پر اردو میں تقریر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کئے جن کے ذریعہ گورنمنٹ قائم شدہ بروئے قانون کے خلاف لوگوں میں نفرت اور حقارت پھیلانے کی کوشش کی۔

ملزم نے خلافت کے تین مبلغین سعید الرحمٰن' جگدمبا پرشاد' اجودھیا پرشاد کی سزایابی کے خلاف اردو میں تقریر کی اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کی اور شوق دلایا کہ وہ بھی ان کی پیروی کریں اور جیل جائیں۔

ملزم نے ایک طویل بیان داخل کیا ہے جو گورنمنٹ کی برائیوں کی داستان سے پُر ہے۔ اس میں نہایت تشریح کے ساتھ ان تمام کارروائیوں کو دکھایا ہے جن کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کو "ظالم گورنمنٹ" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز اپنی تمام کارروائیوں کا ذکر کیا ہے جو ان غیر قانونی کارروائیوں کے خلاف اس نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی تقریروں کی نقل ناقص، غلط اور مسخ شدہ ہے اور محض بے جوڑ اور بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے لیکن وہ ان تمام حصوں کو تسلیم کرتا ہے جن میں گورنمنٹ کے خلاف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جدّوجُہد کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔

میں نے نہایت احتیاط سے یہ تقریریں پڑھی ہیں اور ان پر کامل غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ باغیانہ ہیں اور یہ کہ ملزم نے ان تقریروں کے ذریعے گورنمنٹ قائم شدہ از روئے قانون کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے کی کوشش کی۔

میں ملزم کو حسبِ دعویٰ استغاثہ مجرم پاتا ہوں اور زیر دفعہ 124۔ الف تعزیرات ہند ایک سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔

مولانا نے عدالت میں جو تحریری بیان داخل کیا تھا وہ ایک عظیم ادبی شہ پارہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کا سیاسی درس بھی تھا۔ ملک کے اخبارات نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ اس پر شاندار تبصرے بھی کئے۔ یہاں صرف گاندھی جی کے اخبار "ینگ انڈیا" کی اشاعت 23 فروری 1922ء سے ان کے تبصرے کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ اپنے تبصرے کے ساتھ گاندھی جی نے اس بیان کے خاص خاص حصوں کا ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا "اے گریٹ اسٹیٹ منٹ" گاندھی جی نے لکھا تھا:-

> "مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بیان عدالت میں دیا ہے، اس کی نقل ابھی میرے پاس پہنچی ہے۔ یہ فل سکیپ سائز کے 33 صفحوں پر ٹائپ کیا ہوا ہے، لیکن اس قدر طول طویل ہونے پر بھی سب کا سب پڑھنے کے قابل ہے۔ اصل بیان مولانا کی فصیح و بلیغ اردو میں ہوگا۔ یہ اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ترجمہ بُرا نہیں ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بہتر ممکن تھا۔ مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوبصورتی ہے، وہ نہایت وسیع روانی کے ساتھ پُرجوش بھی ہے۔ وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر آشتی طلب (ان کمپرو مائزنگ) ہے۔ مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ تمام بیان میں اوّل سے آخر تک ایک پُرجوش اثر پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا خلافت اور نیشنلزم پر مولانا ایک پُراثر خطبہ دے رہے ہیں! میں امید کرتا ہوں کہ اس بیان کو چھاپ کر شائع کر دیا جائے گا۔"

مولانا کا بیان پڑھ کر جب میں فارغ ہوا تو ایک بات بہت زیادہ واضح ہو کر میرے سامنے آ گئی۔ یعنی عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے کی اصل ضرورت کیا ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ بے خوفی اور مضبوطی ہم میں کہاں ہوتی جو آج ہمارے اندر کام کر رہی ہے؟......"

"اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر ہم نے عدالتوں کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا تو ہم کو آج مولانا کے بیان جیسی گراں قدر چیز نہیں ملتی جو بجائے خود ایک بہترین سیاسی تعلیم ہے۔

عدالتوں کے بائیکاٹ کا اثر صرف اسی چیز میں نہیں دیکھنا چاہئے کہ کتنے قانون پیشہ اصحاب نے پریکٹس چھوڑ دی؟ اصلی چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے جو ہماہمی اور رونق عدالت گاہوں کے اندر باہر نظر آتی تھی وہ کس طرح اب مفقود ہو گئی ہے؟ اب تو وہ صرف لین دین کرنے والوں اور قمار بازوں کی ایک کمین گاہ ہیں۔ نہ وہ قومی آزادی کا سرچشمہ ہیں' نہ انفرادی آزادی کا۔ اس بات کا اندازہ کہ قوم کیسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے؟ صرف بہادر اور بے خوف دلوں کے جذبات دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

مولانا کے بیان کا روئے سخن اگرچہ عدالت کی طرف ہے' لیکن دراصل وہ ملک و ملّت سے خطاب کر رہے ہیں۔ فی الحقیقت ان کا بیان ایسا ہے گویا عمر بھر کے لئے سخت سے سخت سزاؤں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

ایک سال قید بامشقت سزا کا فیصلہ سن کر مولانا نے کیا خوب کہا:۔ "میں جس سزا کا متوقع تھا' اس سے تو یہ بہت ہی کم ہے"!

اگرچہ یہ باب اپنی طوالت کی ضروری حد تک پہنچ گیا ہے لیکن حضرت مولانا کی اسلامی سیرت کا جو پہلو اس میں نمایاں ہوا ہے' اس کا' نیز بیان کی دل آویزی اور مقامِ عزیمتِ دعوت کی دل ربائی اور حسن آرائی کا تقاضا ہے کہ اس داستان کو اور طول دیا جائے لیکن میں یہاں صرف مولانا غلام رسول مہر مرحوم کا اس بیان پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے' اس باب کو ختم کرتا ہوں' مولانا مہر مرحوم لکھتے ہیں:

اعترافِ جرم: مولانا تقریباً پونے چار سال رانچی میں نظر بند رہنے کے بعد رہا ہوئے تھے' اور دو سال بعد انہیں تحریکِ ترکِ موالات کے قائد و رہنما کی حیثیت میں گرفتار کر لیا گیا۔ دفعہ 124۔ الف کے تحت مقدمہ چلا' اور انہوں نے وہ بیان حق و انصاف کے خلاف جتنے مقدمے آج تک چلے' ان میں سے

سب کے بیان محفوظ نہیں ہیں۔ آخری دور کے بیانوں میں سے میرے خیال میں آئرلینڈ کے محبِّ وطن رابرٹ ایمٹ کا بیان بطور خاص قابل ذکر ہے۔ لیکن مولانا کا بیان بے شائبۂ مبالغہ اس سے بھی بدرجہا بہتر تھا۔

خانہ تلاشی اور تمام مسودات کی بربادی: جس طرح کلکتہ سے نکال دیئے جانے اور رانچی میں قیام کے دوران میں رہائش گاہوں اور چھاپہ خانے کی دو مرتبہ تلاشی ہوئی' اس سے زیادہ سخت انداز میں اس مرتبہ بھی ان کے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ مولانا کا خیال تھا کہ گرفتاری کی صورت میں پریس کے انتظامات میں خلل نہیں پڑے گا کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی اور انہوں نے اس کا پورا انتظام کر لیا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں کام بدستور جاری رہے۔ مولانا لکھتے ہیں "گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس افسانہ کی آخری المناکی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رُک گئی' بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے افسردہ ہو گئے"

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ مولانا کے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے کافی مواد موجود نہیں ہے' تو اسے مواد کی جستجو ہوئی اور تیسری مرتبہ ان کے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے لئے جو لوگ آئے تھے' ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اردو' عربی و فارسی کی استعداد رکھتا ہو۔ جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ملی' انہوں نے خیال کیا' اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہو گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسوّدات کا تمام ذخیرہ اٹھا لے گئے' حتیٰ کہ "ترجمان القرآن" کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسوّدات کے ڈھیر میں ملا دیں۔

قبضہ میں لئے گئے کاغذات کی نہ تو فہرست تیار کی گئی اور نہ ہی ضابطہ کے مطابق اس پر کسی نے دستخط کئے۔ مولانا فرماتے ہیں "افسرانِ تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے۔ صرف یہ لکھ کر متفرق قلمی کاغذات لئے گئے' چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہو گئے"

مولانا پندرہ ماہ کے بعد رہا ہوئے تو انہوں نے حکومت سے کاغذات کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصہ کی خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے لیکن نہایت بُری حالت میں کہ تمام ذخیرہ برباد ہو چکا تھا۔

ہوا یوں کہ جب تفتیشی افسروں نے کاغذات قبضہ میں لئے تو یہ قلمی مسوّدات کے مختلف مجموعے تھے' اور الگ الگ پٹھوں کے دفتیوں میں ترتیب دیئے ہوئے تھے' ان مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا۔ مولانا ان کی تباہی و بربادی کی نقشہ کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جب یہ ملے' تو محض اوراقِ پریشاں کا ایک ڈھیر تھا' اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے' یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔"

اس کا مولانا کی طبیعت پر بہت بُرا اثر ہوا۔ اس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ میرے صبر و شکیب کے لئے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے

کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں۔ یہ سب سے تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے لبوں سے لگایا، لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلو گیر ہے۔"

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے!

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں، اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بیک وقت جمع کروں، میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا، اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:"

زاں شکستم کہ بہ دُنبال دلِ خویش مدام
در نشیبِ شکن زلفِ پریشاں رفتم!!

مولانا کی تصنیفات، مسودات اور یادداشتوں کو ان حادثوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ عظیم ذخیرہ حکومت کی نا اہلی عدم توجہ، کم علمی اور بے اعتنائی کی نذر ہو گیا۔ جو کچھ واپس ملا وہ اس حالت میں تھا جو نہ ہونے کے برابر ہو۔ اس طرح مولانا کی ذہنی کاوشیں، فکری کمالات اور جولانیوں سے ان کے پرستار محروم ہو گئے۔ اس عظیم نقصان کا مولانا کو بھی شدید صدمہ تھا جس کا اظہار انہوں نے "ترجمان القرآن" کی جلد اوّل کے دیباچہ اول میں بڑے دُکھ اور حسرت آمیز لہجے میں کیا ہے۔ ان کا فرمانا ہے:"اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سرِ نو محنت کی جائے لیکن اس حادثہ کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہو گئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثہ کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔"

وہ کہتے ہیں:"طبیعت کی بڑی رکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی، یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہلِ قلم کے لئے اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں۔ وہ ہزاروں صفحے نئے با آسانی لکھ دیگا، لیکن ایک ضائع شدہ صفحے کے دوبارہ لکھنے میں اپنی طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا۔ فکر و طبیعت کی جو گرم جوشی پچھلی محنتوں کی بربادی سے بجھ جاتی ہے، بہت دشوار ہوتا ہے کہ اسے دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو ایسی بدقسمتیوں سے دوچار ہوئے ہوں۔ میں نے ٹامس کارلائل کے حالات میں جب پڑھا تھا کہ اس نے انقلابِ فرانس پر اپنی

مشہور کتاب دوبارہ تصنیف کی' اور اہلِ فن نے اسے قوتِ تصنیف کا ایک غیر معمولی مظاہرہ سمجھا' تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے؟ لیکن اس حادثے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ نہ صرف غیر معمولی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے' اور فی الحقیقت کارلائل کی منصفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا"۔

پھر کئی سال تک ان کی طبیعت اس کام پر آمادہ نہ ہو سکی۔ ترجمہ و تفسیر کے بچے کھچے برباد اوراق کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے طبیعت کا انقباض تازہ ہو جاتا اور دو چار صفحے بادلِ نخواستہ لکھ کر چھوڑ دیتے۔

لیکن مولانا ترجمہ اور تفسیر کی تکمیل و اشاعت کو مسلمانوں کے لئے بڑا ضروری اور اہم خیال کرتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا شدّتِ احساس سے بے قراری میں اضافہ ہوتا جاتا ۔ مولانا اس کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بے تاب تھے لیکن طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔

آخر کار انقباض و رکاوٹ کا زمانہ بیت گیا اگرچہ یہ طویل تھا۔ اب طبیعت میں جنبش اور جوش پیدا ہوا تو افسردگی اور خمار آلودگی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ لکھتے ہیں:۔

" 1927ء قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں' دل کے جوشِ بے اختیار سے خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا تو ابتداء میں چند دنوں تک طبیعت رُکی رہی' لیکن جونہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے' طبیعت کی ساری رکاوٹیں دُور ہو گئیں' اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا' گویا شورش کدۂ ہستی میں افسردگی اور خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا"

بہ بدمستی سزد گر متّہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد!

"اتنا ہی نہیں' بلکہ کہنا چاہیے' شورشِ تازہ کی سرمستیاں' مجلس دوشیں کی کیفیتّوں سے بھی تند تر ہو گئیں"۔:۔

چہ مستی نہ دانم' کہ رُو بہ ما آورد
کے بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد؟

مزید رقمطراز ہیں:۔ "سبحان اللہ! عالم روح و قلب کے تصرّفات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دُور نہیں ہوا۔ یا اب خود بخود کھلی' تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا:۔

شوریست نوا ریزی تار نفسم را
پیدا نہ اے جنبشِ مضراب کجائی؟

بہر حال اب کام شروع ہو گیا تھا اگرچہ حالات اب بھی ناموافق تھے۔ صحت کا اضمحلال بڑھتا جا رہا

تھا' سیاسی مشغولیتوں کی دخل اندازی جاری تھی۔ "تاہم کام کا سلسلہ کم وبیش جاری رہا اور جولائی 1930ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گیا"

تا دست رسم بود' زدم چاکِ گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم!

تیسری گرفتاری

21؍اگست 1930ء

۲۱۔ اگست ۱۹۳۰ءنمکین ستیہ گرہ

حکومت نے نمک جیسی روزمرہ ضرورت کی شئے کی تیاری پر ٹیکس لگایا تو گاندھی جی نے اس کی خلاف ورزی کا اعلان کر دیا۔ وہ 12؍مارچ 1930ء کو ہاتھ میں بانس کی چھڑی لے کر سابرمتی آشرم سے اُناسی (79) رضا کاروں کے ساتھ پیدل ڈانڈی کی جانب روانہ ہوئے۔ ڈانڈی ساحلِ سمندر پر واقع ایک بستی ہے۔ دوصد میل کی مسافت پیدل طے کر کے یہ قافلہ 5؍اپریل کو منزل پر پہنچا۔ گاندھی جی نے جناب عباس طیّب کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ سابرمتی سے روانگی کے وقت گاندھی جی نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:۔

> ”برطانوی حکومت ہندوستان کی جسمانی، اقتصادی، روحانی، مالی اور اخلاقی تباہی کا باعث ہوئی ہے اور اس میں اس نظامِ حکومت کو تباہ کرنے نکلا ہوں۔ میں نے خود بادشاہ کی وفاداری کی تھی اور لوگوں کو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کی تلقین کی تھی۔ میں سیاسیات میں گفت وشنید اور درخواستوں کا قائل تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس حکومت کو راہِ راست پر لانے کے یہ طریقے نہیں ہیں۔ اس حکومت سے بغاوت میرا مذہب اور ایمان ہو گیا ہے۔ ہماری یہ جنگ نہایت پُرامن ہے، ہم کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہے بلکہ انگریزی حکومت کی لعنت کا دھبہ ہندوستان کے

دامن سے دُور کرنے جارہے ہیں۔ اس طرح سے یا تو میری لاش سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آئے گی اور یا پھر آزادی حاصل کر کے رہوں گا۔"

14 اپریل کو انہوں نے صبح نمک بنا کر قانون شکنی کی۔ انہوں نے اپنے پیغام میں کہا:۔

"ہوائیں انسان کے لئے خدا کا انعام ہیں، سمندروں کے پانی غیر ملکی نہیں، ان پر ہمارا حق ہے۔ اگر ہم ان کے پانیوں سے نمک تیار کرتے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں اگر حکومت اس پر پابندی لگاتی ہے، گرفتار کرتی ہے، مقدمہ قائم کرتی ہے تو میں کہوں گا کہ اس صورت میں عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے، نہ ضمانت دی جائے نہ مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لیا جائے۔ پولیس کسی قسم کا تشدد کرے تو عوام پُرامن رہیں۔ اگر اخبارات پر ایسی پابندیاں عائد ہوں تو یہ ضمانت نہ دیں خواہ اخبار بند ہی کیوں نہ ہو جائیں۔"

گاندھی جی کو رات کے سناٹے میں گرفتار کر کے یراودہ جیل میں پہنچا دیا گیا۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی، سارے ہندوستان میں نمک سازی کر کے قانون شکنی ہونے لگی اور جیل خانوں میں بہار آ گئی۔ ملک بھر میں احتجاجی جلسے اور جلوس ہونے لگے۔ کراچی، شولاپور، پٹنہ، کلکتہ، مدراس، امرتسر میں پولیس نے مظاہرین پر گولی چلا دی اس سے کئی افراد جاں بحق ہوئے اور لاتعداد زخمی، سول نافرمانی کے اثرات برما اور رنگون تک پہنچے جہاں فائرنگ سے 5 افراد ہلاک اور 37 زخمی ہوئے۔ شولاپور نے تحریک میں زبردست حصہ لیا، کئی گرفتاریاں ہوئیں، چار افراد کو زیادہ سرگرمی دکھانے کے جرم کی پاداش میں یراودہ جیل میں پھانسی دی گئی۔ انہوں نے رحم کی اپیل نہ کی۔ پھانسی پانے والوں میں عبدالرشید اور قربان حسین بھی شامل تھے۔

تب صوبہ سرحد پر قیامت گزر گئی۔ ویسے بھی صوبہ کے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر حکومت یہاں آزادی اور حریّت کی تحریکوں کے مضبوط ہونے کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ خان عبدالغفار کی رہنمائی اور قیادت میں سرخ پوش تحریک روز بروز مضبوط تر ہو رہی تھی اس کے اثرات پورے صوبے میں پھیل چکے تھے۔ باچا خان کا یہ کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے پٹھانوں جیسی تند خُو، جنگجو اور متشدّد قوم کے رگ و پے سے تشدد نکال کر عدم تشدّد کی راہ پر لگا دیا۔ اس قوم نے برطانوی جبر و استبداد کا مقابلہ بڑے صبر و برداشت اور ہمت سے پُرامن رہ کر کیا اور اہنسا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ حالانکہ حکومت نے اشتعال دلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ یہی برطانوی استعمار کی شکست اور آزادی خواہوں کی فتح و کامرانی تھی۔ انگریز اکثر و بیشتر کہتے تھے:۔

The non-violent Pathan is more dangerous than a violent Pathan.

عدم تشدّد پر کاربند پٹھان متشدّد پٹھان سے زیادہ خطرناک ہے۔

جلیانوالہ باغ کے خون ریز المیّہ کی طرح قصّہ خوانی اور صوبہ سرحد میں حکومت کی بربرّیت تاریخِ آزادی کے بڑے سنگِ میل ہیں۔ انکا تذکرہ یہاں بے جا نہیں۔

18'19 / اپریل 1930ء کو اتمان زئی میں افغان جرگہ نے بہت بڑی کسان کانفرنس کا اہتمام کیا۔ خان عبدالغفار خان کی دعوت پر صوبہ بھر سے بڑی تعداد نے شرکت کی' کانفرنس میں پُرجوش تقاریر سے نیا ولولہ پیدا ہوا اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے کا جذبہ فزوں تر ہو گیا۔ اس اجلاس میں خدائی خدمت گاروں کے نام سے رضا کاروں کی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانگریس نے ستنیہ گرہ کمیٹی تشکیل دی جسے خفیہ رکھا گیا لیکن یہ راز فاش ہو گیا۔ حکومت نے رات کی تاریکی میں کمیٹی کے ارکان کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا حکومت نہیں چاہتی تھی کہ دن کے وقت گرفتاریاں کر کے اشتعال پیدا کیا جائے اِسے عوام کی مزاحمت کا اندیشہ تھا۔ کانگریس کو حکومت کے منصوبہ کا علم ہو گیا چنانچہ رات کو گرفتاری دینے کی بجائے دن کے وقت گرفتاری دینے کا فیصلہ ہوا۔ کانگریس کے فیصلے کی اطلاع سب کو بروقت نہ ہو سکی۔ دو نوجوان غلام ربانی سیٹھی اور الٰہ بخش برق کے سوا دیگر سب کو رات کے اندھیرے میں گرفتار کر لیا گیا۔ بچ نکلنے والے دونوں نوجوان کسی طریقہ سے دفتر کانگریس پہنچ گئے۔ انہیں پولیس نے 23 / اپریل کو دفتر کانگریس سے گرفتار کر لیا۔ پولیس نے حماقت یہ کی کہ دونوں کو پیدل لیکر بازار میں چلنا شروع کر دیا۔ راستہ میں لوگ ساتھ ہو لئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جلوس بن گیا۔ اب پولیس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے دونوں نوجوانوں کو گاڑی میں بٹھانا چاہا اس پر ہجوم بے قابو ہو گیا اور اشتعال میں آ کر گاڑی کے ٹائر پھاڑ دیئے۔ بے قابو ہجوم کے جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے پولیس حواس باختہ ہو گئی اِس نے بد حواسی کے عالم میں دونوں محبوس جوانوں کو چھوڑ دیا اور اپنی جان بچا کر نکل گئی۔

رہائی پانے پر غلام ربانی سیٹھی اور الٰہ بخش برق کی قیادت میں بہت بڑا جلوس شہر کا چکر لگا کر کابلی گیٹ تھانے کے سامنے پہنچا اور دونوں نے رضا کارانہ گرفتاری پیش کی۔ انقلاب زندہ باد اور برطانوی سامراج مردہ باد کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پولیس نے مشتعل ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ ہجوم میں سے کسی نے شرارت کی اور پولیس پر پتھر پھینک دیا۔ اس سے انتظامیہ کو بہانہ مل گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے تھانہ کی حفاظت کے نام پر مسلح کمک موقع پر پہنچا دی۔ ایک آرمرڈ کار بڑی تیزی سے کابلی دروازہ کے اندر داخل ہوئی اور ہجوم پر چڑھ دوڑی ایک نوجوان لالہ دسوندی رام اس کی زد میں آ کر کچلا گیا۔

دسوندی رام کی موت سے ہجوم سخت مشتعل تھا کہ اتنے میں مزید آرمرڈ کاریں پہنچنے لگیں اس سے عوام میں مزید اشتعال پھیل گیا۔ آرمرڈ کاروں کے پیچھے ایک فوجی افسر موٹر سائیکل پر نمودار ہوا۔ عبدالرحمان مانی نے اشتعال میں آ کر اسے تیز دھار آلہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک دوسرا شخص

سید علاؤالدین غصہ پر قابو نہ پاسکا اس نے آرمرڈ کار کی پٹرول کی ٹینکی کو آگ لگادی۔ یہ ڈرائیور سمیت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ ہجوم نفرت و حقارت ' غصہ اور جوش و جذبہ سے دیوانہ ہوچکا تھا اِن کے سامنے برطانوی جاہ و جلال اور وقار خس وخاشاک سے زیادہ نہ تھا۔ حکومت نے کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی خاطر وارننگ دیئے بغیر اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔ ہجوم اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ فائرنگ صبح گیارہ بجے شروع ہوئی اور یہ سلسلہ تین بجے سہ پہر تک جاری رہا۔ گورے فوجیوں نے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے گلی کوچوں میں گھروں کے اندر گھس کر بے گناہوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ انسانی زندگی بے توقیر ہو گئی تھی۔ قصہ خوانی بازار شہیدوں کی لاشوں اور زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ جس طرف نگاہ اٹھتی تھی انسانی لاشے پڑے ہوئے تھے۔ تب پشاور کے علاوہ بازار کلاں ' ٹکر ' کوہاٹ ' صوابی اور چارسدہ میں بھی فائرنگ کے واقعات رونما ہوئے۔ بے شمار لوگ مارے گئے ان گنت زخمی ہوئے۔ مردان کے علاقہ میں فوج نے شدید گولہ باری کر کے زبردست تباہی مچائی۔ سرگرم قومی سیوا داروں کے گھر نذرِ آتش کر دیئے گئے مال واسباب لوٹ لیا اور دکانیں جلادیں اِن میں ملک معصم خان ' جرنیل شمروز خان اور غلام محمد خان لونڈخور کے نام قابل ذکر ہیں۔ الغرض مالاکنڈ سے لیکر ڈیرہ اسماعیل خان تک کوئی جگہ نہ تھی جہاں خدائی خدمت گاروں کے دفتر بچے ہوں اِن کے حجروں ' مکانات ' دفاتر کا سامان اور سرخ وردیاں سب جلادی جاتی تھیں۔

اس قدر بربریّت اور خون آشامی کے باوجود حکومت کے انتقام کی آگ نہ بجھی تھی۔ حکومت کے مظالم کی اطلاع قبائل کو پہنچی تو وہاں بھی اشتعال پھیل گیا وہاں سے پشاور پر حملہ کی اطلاعات ملیں تو حکومت نے پشاور کا انتظام گھڑوالی رجمنٹ کے سپرد کرنا چاہا یہ ہندوستانیوں پر مشتمل تھی اِس نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے ہم وطنوں پر گولی چلانے کی معصیت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس رجمنٹ کو فوری طور پر غیر مسلح کر کے بمبئی روانہ کر دیا گیا اِن کا کورٹ مارشل ہوا اور طویل المیعاد سزائیں دی گئیں۔

اب شہر کا انتظام گورا فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ صوبہ میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور صوبہ سے باہر جانے اور داخل ہونے پر سخت پابندی عائد کر دی۔

پشاور کے دردناک واقعہ کی خبر باچاخان کو ملی تو وہ اپنے ہمراہیوں کو لیکر پشاور کی جانب روانہ ہوئے۔ انہیں راستہ میں رسالپور کے قریب سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر کے گرفتار کر لیا گیا اور خان بہادر قلی خان اسسٹنٹ کمشنر آف چارسدہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ ان سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی باچاخان نے ضمانت پر رہا ہونے پر انکار کر دیا چنانچہ انہیں فرنٹیر کرائمز ریگولیشن کی دفعہ نمبر 46 کے تحت تین سال کی قید کا حکم سنا کر گجرات سپیشل جیل بھیج دیا۔

باچاخان کی سزایابی کے بعد حکومت نے خدائی خدمتگاروں کے جذبۂ حریّت کو شکست دینے کے لئے

انتہائی گھٹیا حربے استعمال کرنے شروع کئے اس کا خیال تھا کہ وہ باچاخان کی عدم موجودگی میں ان کی تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائیگی۔ شاید اسے نہیں معلوم تھا کہ جن کے سینوں میں آزادی کی لو روشن ہو جاتی ہے وہ مصائب و آلام سے نہیں گھبراتے بلکہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ آزادی کا پودا خون کی آبیاری کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ برطانوی استبداد اور خدائی خدمت گاروں کے صبر و برداشت کی داستانیں بڑی دلخراش اور سبق آموز ہیں۔ جرات مندی ' بہادری ' شجاعت ' ہمت اور جواں مردی کے واقعات حوصلہ افزا اور رہنما ہیں۔ برطانوی استعمار انتہائی پستی پر اتر آیا تھا۔ حریّت پسندوں کی عزّتِ نفس سے کھیلنا روز کا معمول بن چکا تھا لیکن خدائی خدمت گاروں نے حکومت کے اوچھے ہتھکنڈوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان کے پائے استقلال میں ذرّہ برابر لغزش نہ آئی۔

ڈپٹی کمشنر نے فیض محمد کے کپڑے اتار کر ننگا ہونے کا غیر اخلاقی حکم صادر کیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے حکم عدولی کو بے عزتی محسوس کیا۔ اس نے فوج کو یہی حکم دیا۔ فیض محمد نے زبردست مزاحمت کی لیکن کئی فوجی جوانوں کے سامنے وہ بے بس ہو گیا۔ اسے زدوکوب کیا گیا۔ کئی خدائی خدمت گاروں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ محمد نقیب خان خدائی خدمت گاروں کا سالار تھا اُسے بے رحمی سے سرِعام پیٹا گیا۔ اس کے کپڑے زبردستی اتارے گئے یہاں تک کہ جوتے بھی اتروا لئے۔ پولیس نے حراست میں لیا تو سر پاؤں اور بدن سے ننگا تھا صرف ایک شلوار اس کے جسم پر تھی۔

خان عبدالولی خان چودہ برس کا نوعمر جوان سرخ وردی زیب تن کئے اس کربلا میں موجود تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ خان عبدالغفار خان کا فرزند ہے یہ سن کر ڈپٹی کمشنر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے گالی بکی۔ ڈپٹی کمشنر کے تیور دیکھ کر فوج کے گورے سپاہی نے رائفل تان لی۔ حسین خان خدائی خدمت گار قریب کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا اس نے ڈپٹی کمشنر کی بدنیتی بھانپ لی۔ ولی خان کو گود میں اٹھایا اور نیچے چھلانگ لگا دی اور بھاگ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ اس طرح ولی خان کی جان بچی۔

صوبہ سرحد کے خون آشام واقعات کی اطلاع جان پر کھیل کر ' دریائے سندھ تیر کر عبور کر کے باچا خان تک پہنچائی۔ وہ پختونوں کے خون ناحق کی داستانیں سن کر تڑپ اٹھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ فرنگی صوبہ سرحد سے خدائی خدمت گاروں کی قوت کو ختم کر کے اسے بیگار کیمپ بنا دینا چاہتا ہے۔ خدائی خدمت گار تنہا حکومت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے اندریں حالات خدائی خدمت گار تحریک کو ہندوستان کی سطح کی کسی جماعت سے منسلک کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے رفقاء کو ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ کے قائدین سے ملاقات کر کے اپنے صوبے کے حالات سے آگاہ کریں۔ اگر وہ مدد کے لئے تیار ہوں تو خدائی خدمت گاروں کا الحاق مسلم لیگ سے کر دیا جائے۔ وفد دو ماہ تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن مسلم لیگ کی جانب سے مثبت جواب نہ ملا۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ ان کی داستانِ مظلومیت سے دنیا کو آگاہ کرنے کی حامی بھرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ دراصل خدائی خدمت گاروں سے ہمدردی کا

اظہار کرنا برطانوی سامراج کے عتاب کو دعوت دینا تھا اور یہ مسلم لیگ کے مزاج کے منافی تھا۔

لاچار ہو کر کانگریس سے رابطہ قائم کیا گیا۔کانگریس اور خدائی خدمت گاروں کے مقاصد میں ہم آہنگی تھی۔ چنانچہ کانگریس نے صوبہ سرحد کے واقعات کی تحقیقات کے لئے سردار وٹھل بھائی پٹیل کی سرکردگی میں کمیٹی قائم کر دی۔ حکومت نے کمیٹی کے صوبہ میں داخلہ کی ممانعت کر دی۔ تحقیقاتی کمیٹی نے اٹک اور راولپنڈی میں بیٹھ کر اپنا کام نپٹایا۔ گواہوں کے بیانات قلم بند کئے۔ رپورٹ کے مطالعہ سے خدائی خدمت گاروں کے عظمت کردار ' سیاسی طرز عمل ' غیرت وحمیت اور ان کے وسیع سیاسی اثرات اور تربیت کا علم ہوتا ہے۔ یہ واقعات معلومات افزاء ' عبرت ناک ' سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ جرأت مندی اور استقامت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزادیٔ وطن کی جدّوجہد میں کون سے عناصر نے سرفروشی دکھائی اور کون منقار زیر پر رہے؟ کس نے خون دیا؟ آزادی کی گراں قیمت ادا کرنے والے کون تھے؟ کس قدر طویل جدوجہد کے بعد آزادی کا آفتاب طلوع ہوا۔ وہ کون تھے جنہوں نے آزادی خواہوں کی مخبری کی اور برطانوی سرکار سے انعام واکرام پائے اور سینوں پر فخر سے تمغے سجائے۔ یہ تمغے قوم سے بےوفائی کے عوض ملے تھے۔انہی عناصر نے انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے بعد آزادی کو اغوا کیا۔

آزادی محض قرار دادیں پاس کر دینے سے ہاتھ نہیں آتی۔ اس کے لئے طویل اور صبر آزما جدّوجہد کرنی پڑتی ہے۔ خون دینا پڑتا ہے۔جیلوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں کو آباد کرنا پڑتا ہے۔ جائیدادیں ضبط کرانا پڑتی ہیں اور پھانسی کے پھندے کو گلے کا ہار بنانا پڑتا ہے۔ آزادی کے پودے کی خون سے پرورش کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر تناور درخت بنتا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے حکم سے چارسدہ میں خدائی خدمت گاروں کے دفتر کا فوج نے محاصرہ کر لیا۔ فوج دروازہ توڑ کر اوپر جانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو چھلانگیں لگا کر بالکونی کے راستے داخل ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر نے دفتر میں موجود سرخ پوشوں کو وردیاں اتارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے سالار کی ہدایت کے مطابق انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کرتے ہوئے دفتر سے نیچے آ گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے بزور وردیاں اتروانا چاہا۔

"جب تک ہم زندہ ہیں وردیاں اترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" یہ تھا جواب خدائی خدمت گاروں کا۔

حکومت کے غیر مہذب اور اخلاق باختہ سلوک سے ہر طرف اشتعال پھیل گیا۔ لوگ اپنے گھروں کی طرف بھاگے ' جلدی جلدی اپنے کپڑے سرخ رنگ میں بھگو کر گیلے ہی زیب تن کر کے واپس آ گئے اور خدائی خدمت گاروں کی صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہم خدائی خدمت گار نہ تھے آزادی کے مجاہدوں کے ساتھ تمہارے سفاکانہ سلوک نے ہمارے سینوں میں نفرت کے الاؤ روشن کر دیئے ہیں ہم آج سے خدائی

خدمت گار ہیں"۔

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر کے جنوں و جبر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ طاقت کے بل پر عوام کو شکست دینا چاہتا تھا۔ جب تمام حربے ناکام ہو گئے تو فوج نے سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ سنگینوں کی نوک پر دیہاتیوں کو خدائی خدمتگار نہ ہونے کی تحریری یقین دہانی پر مجبور کرنے لگا' ان کی حمیت نے یہ ذلت گوارا نہ کی۔ انہوں نے انگوٹھے لگا کر رہا ہونے پر جور و ستم کا سامنا کرنے کو ترجیح دی۔ اس سے حکومت کو سخت خفت اٹھانا پڑی۔ ڈپٹی کمشنر کسی طریقے سے ایک معصوم دیہاتی کو بہلا پھسلا کر انگوٹھا لگوانے میں کامیاب ہو گیا اور اسے رہا کر دیا۔ اس کی بیوی گھر میں کپڑے دھو رہی تھی۔ خاوند کو گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سارا گاؤں ابھی تک فوج کی حراست میں تھا' اسے شک گزرا کہ اس کا خاوند انگوٹھا لگا کر رہا ہوا ہے' اس نے چیخ کر پوچھا:۔

"تم یہاں کیسے آ گئے؟ تم نے انگوٹھا لگایا ہے؟ مجھے انگوٹھا دکھاؤ"

اس کے پاس بیوی کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا وہ سخت نادم ہوا الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا اور پھر کبھی لوٹ کر گھر نہ آیا۔ یہ تھی خدائی خدمت گار تحریک کی گہرائی جس نے خواتین کے دلوں میں بھی آزادی اور ثابت قدمی کی جُوت جگا دی تھی۔

ضمانت داخل کرنے اور ضمانت پر رہائی پانے والے حاجی شاہ نواز کا ایک واقعہ "میری زندگی اور جدوجہد" میں خان عبدالغفار خان نے لکھا ہے کہ وہ جیل سے ضمانت پر رہا تو ہو گیا لیکن لوگوں کے طعن و تشنیع کی تاب نہ لا سکا' اس کے لئے جینا دوبھر ہو گیا مارے شرم و ندامت کے کسی کا سامنا نہ کرتا تھا۔ ایک دن تنگ آ کر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

مولانا آزاد انڈیا ونز فریڈم میں کہتے ہیں کہ ستیہ گرہ کی اٹھان نے حکومت اور قوم دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ حکومت نے سختی کے ساتھ اس کے خلاف کارروائی کی اور کانگریس کو خلافِ قانون جماعت قرار دے کر اس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ کانگریس نے اس وار کا مقابلہ اس طرح کیا کہ ہر صدر کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار تھا۔ مولانا آزاد بھی صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو نامزد کیا۔ انہوں نے گرفتاری سے قبل ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ تاریخ احرار مطبوعہ مارچ 1968ء کے صفحہ 84 پر کتاب کے مصنف چودھری افضل حق رقمطراز ہیں۔ مولانا نے گرفتار ہوتے وقت بلا مشورہ مجھے اپنی جگہ قائم مقام مقرر کیا تھا حالانکہ میری صحت ٹھیک نہیں تھی۔ چودھری افضل حق نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے خلافِ قانون اجلاس منعقدہ دہلی میں شرکت کی تو ڈاکٹر انصاری' وٹھل بھائی پٹیل' پنڈت مدن موہن مالویہ اور دوسرے اراکین کے ہمراہ گرفتار ہو کر نو ماہ کے لئے سزایاب ہوئے۔ انہیں دہلی جیل میں رکھا گیا۔ ان کی

گرفتاری مئی 1930ء کو ہوئی۔

مولانا کانگریس کے قائم مقام سربراہ کے طور پر میرٹھ کے دورہ پر گئےوہاں ان کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ شہر کی بڑی شاہراہوں پر تاریخی جلوس نکلا۔ مولانا کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ جلوس کے بعد برف خانہ کے میدان میں جلسہ منعقد ہوا مولانا نے بڑے پُرجوش انداز میں خطاب فرمایا۔ حکومت نے ان کی تقریر کو خلافِ قانون قرار دے کر مقدمہ قائم کر دیا۔ انہیں گرفتار کر کے میرٹھ لایا گیا' ان پر مقدمہ چلا' عدالت نے ڈیڑھ برس کی سزا سنائی اور میرٹھ جیل میں بند کر دیا۔ یہاں انہوں نے تقریباً چار ماہ گزارے اور پھر گونڈا جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔

میرٹھ اور گونڈا جیلوں کی مصروفیات اور اشتغال کا احوال مولانا کے دو اسیر رفقاء مولانا اسداللہ خان اور یوپی ضلع بجنور کے عبداللطیف نے لکھا ہے۔ "لطیف کی کہانی" کے نام سے ان کی آپ بیتی شائع ہوئی ہے۔ جس میں "گونڈا جیل اور مولانا آزاد کا ساتھ" کے زیر عنوان جیل کے شب وروز کی داستان بیان کی۔ پہلے میرٹھ جیل میں چار ماہ کی کہانی مولانا اسداللہ خان میرٹھی کی زبانی۔

میرٹھ جیل کی داستان

ان کے بیان کے مطابق امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام
آزاد رحمتہ اللہ علیہ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں 1930ء کے موسم گرما میں کلکتہ سے اسیر ہو کر فرنگی سارجنٹوں کی حفاظت میں بذریعہ ریل گڈھ مکتیسر اور وہاں سے بذریعہ کار میرٹھ جیل لائے گئے۔ اس وقت حضرت مولانا کانگریس کے ڈکٹیٹر تھے۔ اس گرفتاری سے چندروز پیشتر بھی میرٹھ تشریف لائے تھے۔ اس وقت اہلِ میرٹھ نے مولانا کے شایانِ شان استقبال کیا تھا اور مولانا کا تاریخی جلوس بھی بڑی شاہراہ پر نکالا تھا۔ میرٹھ کے حلوائیوں نے اس مسرت میں اپنی دکانوں سے مٹھائی کے تھال کے تھال لٹا دیئے تھے۔ جلوس کے بعد برف خانہ کے میدان میں پبلک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں حضرت مولانا نے پورے جوش و جلال کے ساتھ اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں تقریر فرمائی تھی اِسی تقریر کے سلسلہ میں میرٹھ کے مجسٹریٹ کی جانب سے وارنٹ گرفتاری جاری ہوا اور آپ کو میرٹھ لایا گیا' مقدمہ چلا اور سزائے قید کے نتیجے میں میرٹھ جیل میں بند کر دیا گیا۔

آپ جیل میں مطالعۂ کتب یا تحریری کام میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ میرٹھ جیل کی ہر بارک اے بی کلاس کے سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص تھی اِس بارک میں اس وقت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب' حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مرحوم' قاضی نجم الدین صاحب مرحوم' چودھری چرن سنگھ اور آنجہانی پنڈت پیارے لال شرما وغیرہ تھے۔

حضرت مولاناابوالکلام آزاد کابھی صبح وشام کچھ وقت اس پارک میں گزرتا تھا۔ آپ جس وقت تک اس پارک میں رہتے تھے پوری پارک کے حضرات مولانا کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ سب کی نظریں اور پوری توجہ حضرت مولانا کے سراپا پر مرکوز رہتی تھیں اور حقیقی طور پر شمع اور پروانوں کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ اس پارک کے سب سے بزرگ اور محترم لیڈر پنڈت پیارے لال شرما مولانا کے سامنے ہمیشہ دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے کبھی انہوں نے مولانا کی جانب پیٹھ نہیں کی۔ مولانا کی موجودگی میں چار چار گھنٹہ تک کبھی سگریٹ نہ پیا، حالانکہ آپ سگریٹ کے بے حد عادی تھے اور پانچ منٹ بھی بغیر سگریٹ کے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ شرماجی حضرت مولانا کے واسطے ترکاری خود اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔

حضرت مولانا کی مجلس میں اکثروبیشتر علمی و تاریخی واقعات پر تبصرے ہوتے تھے۔ حاضرین جس قسم کا بھی سوال کرتے تھے حضرت مولانا بلا تکلف اس کا تحقیقی جواب دیتے تھے۔ اگر انقلابِ فرانس کا کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب اس طرح دیتے تھے گویا آپ خود ہی انقلابِ فرانس کے بانی ہیں۔ واقعات مع تاریخ اور انقلابیوں کے نام بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے پتنگ اور پتنگ بازی کی تاریخ یہ سمجھ کر پوچھی کہ شاید مولانا اس کے متعلق کوئی جواب نہ دے سکیں گے لیکن مولانا نے اس کا بھی جس تحقیق کے ساتھ جواب دیا اس کو سن کر حاضرین دنگ رہ گئے اور مولانا کی ذہانت اور وسعتِ معلومات پر محوِ حیرت ہو کر رہ گئے، اس قسم کے سوالات نوجوان طبقہ خصوصیت سے کرتا تھا۔ خاص کر مسٹر کشن چند ایم اے جو فلاسفر کے نام سے موسوم تھے اور آج کل ہند پارلیمینٹ کے رکن ہیں۔ چنانچہ مسٹر کشن چند نے میرٹھ کالج کی لائبریری سے فلسفہ کی ایک مشہور انگریزی کتاب منگوائی جو میرٹھ کالج میں ولایت سے منگوائی گئی تھی اور وہ ایسی تصنیف تھی جس کی ہندوستان میں اس وقت صرف چند ہی جلدیں آئی تھیں۔ مسٹر کشن چند نے اس کتاب کا مطالعہ کیا لیکن اس کتاب کو وہ باوجود اپنی عظیم قابلیت اور ہمہ دانی کے کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے اس کتاب کے متعلق اپنے چند نوجوان ساتھیوں سے ذکر کیا اور آخر کار یہ طے کیا کہ چلو آج مولانا سے اس کتاب کے متعلق گفتگو رہے گی۔ چونکہ حضرت مولانا ہر علم اور اہم علمی کتابوں کے متعلق اپنے وسیع معلومات رکھتے تھے اور ہر موقع پر فرماتے تھے کہ میرے بھائی میں نے اس کتاب کو فلاں جگہ دیکھا ہے اور اس میں یہ یہ لکھا ہے چنانچہ یہ نوجوانوں کا گروہ مولانا کی خدمت میں گیا کہ دیکھیں مولانا آج اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ان کا زعم یہ تھا کہ مولانا اس دقیق کتاب کا ایک حرف بھی نہ سمجھ سکیں گے اور پھر ہمیں تفریح لینے کا موقع ملے گا۔

چنانچہ کشن چند نے مولانا کو جا کر یہ کتاب دی اور کہا کہ مولاناجی اس کتاب کو بتایئے کہ یہ کیا ہے اور اس میں کیا لکھا ہے ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مولانا نے اس کتاب کو اوّل تا آخر دیکھا اور رکھ لیا۔ فرمایا کہ میرے بھائی اسے میرے پاس چھوڑ دو میں اسے کل کسی وقت دیکھ کر بتاؤں گا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ اگلے دن جب مولانا صاحب گیارہ نمبر بارک میں آکر بیٹھے۔ یہ لوگ مولانا کے پاس پہنچے اور کتاب

کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہاری سمجھ میں کیا چیز نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو اس کو کچھ بھی نہیں سمجھے۔ مولانا نے ان کو اس کتاب کا صفحہ اوّل سمجھایا اور اس کے بعد پوری کتاب کی حقیقت بتادی اور اس پر اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا اور فرمایا کہ مصنف نے اس کتاب میں فلاں فلاں جگہ ٹھوکر کھائی ہے اور وہ فلاں جگہ خود نہیں سمجھا وہ یہ سمجھا ہے اور اصل یہ ہے۔

حضرت مولانا کی اس وضاحت کے بعد جب کشن چند نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو اب پوری کتاب سمجھ میں آ گئی۔ اس وقت ان لوگوں کو حضرت مولانا کی غیر محدود قابلیت اور اعلیٰ ترین ذہانت پر بے حد حیرت ہوئی۔

حضرت مولانا کی رہائش گاہ ہسپتال کی باؤنڈری میں تھی اور جیل کے دستور کے خلاف حضرت مولانا کا بنگلا رات دن میں کسی وقت بھی بند نہیں ہوتا تھا۔ مولانا اکثر رات کے آخری حصے میں 4 بجے کے قریب ہسپتال میں روزانہ ٹہلا کرتے تھے۔ اس وقت آپ اکثر عباء پہنا کرتے تھے۔ یہ ناچیز بھی گیارہ نمبر بارک سے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا اس لئے مولانا کے اس اندازِ خرام کو روزانہ ہسپتال کے اندر سے دیکھتا تھا۔ مولانا اس وقت بھی قرآن کریم کی آیات تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ کبھی عربی و فارسی اشعار پڑھتے ہوئے گشت کرتے رہتے تھے۔ صبح کے سہانے وقت میں مولانا کا ترنم ولہجہ نہایت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا بے خودی کے عالم میں ہیں اور اسی عالم میں جو کچھ زبان پر آ رہا ہے مست ہو کر پڑھ رہے ہیں۔ مولانا تقریباً چار ماہ میرٹھ جیل میں رہے اس کے بعد آپ کو گونڈا جیل میں بھیج دیا گیا۔ جب تک آپ میرٹھ جیل میں رہے آپ کا صبح خیزی و چہل قدمی کا یہ مشغلہ برابر جاری رہا۔

میرٹھ جیل کا جیلر اس وقت ایک ...... تھا جو نہایت ظالم اور سنگدل تھا وہ قیدیوں پر بے حد سختیاں کرتا تھا لیکن مولانا کے آنے کے بعد اس کی استبدادیت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ حضرت مولانا جیل کے کسی قیدی کے ساتھ جیل اتھارٹی کی کسی سختی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سیاسی نظر بند پر سختی کرتے دیکھ کر نہایت برافروختہ ہوئے اور جیل اتھارٹی کو بری طرح ڈانٹا۔ مولانا کی ان باتوں سے جیلر بہت پریشان تھا۔ غالباً اسی کی کوشش سے مولانا کو میرٹھ سے گونڈا بھیجا گیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ اس وقت ایک مسلمان مسٹر کرنل رحمان تھے۔ وہ مولانا کا بہت احترام کرتے تھے اور ایک دو مرتبہ اپنے خاص مہمانوں کو بھی جو باہر سے آئے تھے مولانا سے ملاقات کرانے جیل میں لائے لیکن مولانا کسی سے ملنا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا کی یہ بات جیل میں بھی بارہا دیکھی کہ جب کوئی بڑا افسر ہندوستانی یا انگریز جیل میں آتا اور مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تو مولانا یا تو بات کم کرتے تھے یا اس کا جواب اردو میں دیتے تھے......

غرض امام الہند جب تک میرٹھ جیل میں رہے عام قیدیوں کو آپ کے دم سے بے حد راحت رہی جہاں کسی قیدی کو افسران جیل نے کچھ کہا وہ آ کر مولانا سے شکایت کر دیتا تھا۔ مولانا کی قیام گاہ کے قریب

ہی تنہائی کی کوٹھڑیاں تھیں جن میں نوعمر رضا کار بند رہتے تھے۔ مولانا روزانہ صبح و شام ان کی خبر گیری رکھتے تھے اور اکثر اپنے کھانے میں سے بچا کر ان کو ترکاری اور روٹی دیتے رہتے تھے اس سے مولانا کی رحمدلی اور چھوٹوں پر شفقت کا اندازہ بھی ہوا۔

جب تک مولانا جیل میں نظر بند رہے جیل والوں کے ظلم وجور پر اوس پڑی رہی۔ جیل کی فضا میں مسرت و شادمانی چھائی رہی۔ ساری جیل کی بارکوں میں صبح و شام انقلاب زندہ باد اور مولانا آزاد کی جے کے نعرے بلند ہوتے رہے اور ہر سیاسی قیدی کا حوصلہ بے حد بلند رہا

آپ تقریباً چار ماہ میرٹھ جیل میں رہے 'اس کے بعد آپ کو گونڈا جیل بھیج دیا گیا۔

گونڈا جیل میں بھی ایک ایسے صاحب تھے' جنہوں نے اپنی خود نوشت میں گونڈا جیل میں حضرت مولانا آزاد کے شب و روز کے معمولات کو مرتب کر دیا ہے۔ میرا اشارہ بجنور کے عبداللطیف کی طرف ہے جنہوں نے "لطیف کی کہانی" کے عنوان سے اپنی سیاسی آپ بیتی لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے "گونڈا جیل اور مولانا آزاد کا ساتھ" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ ایک روز جیلر صاحب نے مجھ کو علیحدہ لے جا کر خوشخبری سنائی کہ حضرت مولانا آزاد بھی میرٹھ جیل سے تبدیل ہو کر گونڈا جیل تشریف لا رہے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی ہدایت کی کہ یہ خبر راز ہی میں رہنا چاہئے اور کہا کہ جس وقت مولانا تشریف لائیں گے وہ مجھے مطلع کر دیں گے اور میرے کہنے کے مطابق وہ مجھے پھاٹک ہی پر بلا لیں گے۔ چنانچہ ایک دن ایک قیدی مجھے بلانے آیا اور اطلاع دی کہ جیلر صاحب مجھے پھاٹک پر بلا رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا اور پھاٹک کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا آزاد بیچ پھاٹک میں ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ جیسے ہی حضرت نے مجھے دیکھا۔ فرمایا...... "میں کیا دیکھ رہا ہوں" ...... میں نے عرض کیا "لطیف موجود ہے" ...... تو فرمایا کہ...... "میرے بھائی میں سمجھا تھا کہ میں کوردہ میں آ گیا ہوں' یہاں تو لطیف موجود ہے" ...... میں مولانا کو وہیں چھوڑ کر اپنی بیرک کی طرف جلدی سے لپکا کہ حضرت کے لئے جگہ کی صفائی وغیرہ کر دوں۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا بھی وہیں تشریف لے آئے۔ اس بیرک میں اے کلاس کے سیاسی قیدی تھے۔

جیلر نے مولانا کا سگریٹ کا ڈبہ رکھ لیا اور صرف پانچ سگریٹ مولانا کے پاس رہنے دیئے۔ جیلر کو معلوم نہ تھا کہ مولانا کو جیل میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے۔ مولانا کے بتا دینے پر فوراً ہی سپرنٹنڈنٹ جیل میرٹھ کو یہ معلوم کرنے کے لئے تار دے دیا کہ مولانا کو جیل میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے یا نہیں۔ بہر حال مولانا پانچ سگریٹ لے کر ہماری بیرک میں تشریف لے آئے تھے۔ ان کے لئے یہ پانچ سگریٹ 15 منٹ کے تھے۔ سگریٹ ختم ہو گئے تو مجھ سے فرمایا "خواجہ بجنوری سگریٹ کا کیا ہو؟ (مولانا مقدمہ دیوبند کے بعد مجھ کو خواجہ بجنوری اور علامہ بجنوری کے نام سے پکارتے تھے) میں نے کہا۔ "حضرت میرے پاس بیڑی کے بنڈل آتے ہیں وہ حاضر ہیں" اس پر مولانا نے فرمایا "ہاں میرے بھائی بیڑی سے

شغل کیا جائے" میں نے بیڑی پیش کر دی..... دو تین دن بیڑی کا شغل جاری رہا۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے۔ میرے بھائی بیڑی تو بڑی اچھی چیز ہے میں نے عرض کیا اس وقت چونکہ ایجیٹیشن سگریٹ موجود نہیں ہیں۔ اس لئے بیڑی اچھی معلوم ہوتی ہے میرٹھ سے جواب آنے کے بعد بیڑی کا یہ شغل ختم ہو گیا تھا۔ دو تین دن کے بعد مولانا اپنی خواہش پر ہماری بیرک سے علیحدہ ایک کمرہ میں پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت مولانا ترجمان القرآن لکھ رہے تھے اور غالباً علیحدہ کمرہ پسند کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔

میرے پاس جیل میں چوری سے اخبار "پانیر" آتا تھا۔ رات کو جب بارک بند ہو جاتی تھی تو میں حسبِ دستور اخبار شروع کر دیتا تھا۔ حضرت نے مجھے اخبار پڑھتے دیکھا تو فرمایا "خواجہ بجنوری کیا پڑھ رہے ہو" میں نے عرض کیا حضرت "پانیر" پڑھ رہا ہوں۔ مولانا نے اخبار طلب فرمایا اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ مجھے اور سب لوگوں کو اس پر بہت تعجب ہوا اور میں نے مولانا سے دریافت کیا "حضرت آپ نے انگریزی بھی پڑھ لی"

مولانا نے ارشاد فرمایا "ہاں میرے بھائی انگریزی کی ضرورت تو رہتی تھی۔ میں نے اپنے ایک بنگالی دوست سے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی سیکھ لی تھی پھر بائبل کو اس کے اردو ترجمے اور ڈکشنری کی مدد سے پڑھا تو انگریزی آ گئی"

اس بیرک میں ودیاپیٹھ بنارس کے کئی قابل پروفیسر بھی موجود تھے۔ جب کبھی مولانا کی موجودگی میں کوئی مسئلہ زیر بحث آجاتا اور مولانا اس پر گفتگو فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اس مسئلہ سے مکمل طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔

جیل کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے اور اس عجوبے کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کا تجربہ رکھتے ہیں' ہمارے ساتھیوں میں مسٹر باسدیو شاستری بنارس والے بھی تھے۔ ان کی بڑی لمبی چوٹی تھی اور یہیں نصراللہ خان عزیز ایڈیٹر اخبارِ مدینہ بھی تھے۔

ان کو بھی ایک یا دو سال کی سزا ذیل کے اشعار کی بنا پر ہوئی تھی۔

لوٹ کر ویران کر ڈالا گلستانِ وطن — اب نہ وہ رنگِ وطن ہے اور نہ وہ شانِ وطن
جڑ سے کٹ جائے الٰہی اس کا یہ نخلِ مراد — جس نے یوں برباد کر ڈالا گلستانِ وطن
ہم سے کیوں خائف کرتے ہیں اسے یارانِ وطن — ہے فرنگی چند دن کا اور مہمانِ وطن
عشرتِ فردوس کی تمہید ہے قیدِ فرنگ — خُلد میں کھلتا ہے یعنی بابِ زندانِ وطن
کیا شہادت سے بھی بڑھ کر ہے کوئی عیش و نشاط — سوچتے کیا ہو اٹھو اے نوجوانانِ وطن
نوجوانو! آؤ میدانِ عمل پھر گرم ہے — تابہ کے یہ عیش و عشرت تابہ کے یہ ناؤنوش

ایک رات کا ذکر ہے۔ مسٹر شاستری نصراللہ خان عزیز کے سامنے سے گزرے ان کی لمبی چوٹی لٹک رہی تھی۔ نصراللہ خان نے کہا "شاستری جی اس چوٹی کی کیا تک ہے"؟..... انہوں نے برجستہ کہا.....

"مولوی صاحب چوٹی کی ٹمنک نہیں ہے تو اس داڑھی کی کیا ٹمنک ہے" ...... نصراللہ خان نے کہا "میں داڑھی تو منڈوا سکتا ہوں" انہوں نے بھی جواب دیا۔ "میں چوٹی کٹوا سکتا ہوں" یہ سب گفتگو میری موجودگی میں ہو رہی تھی۔

دوسرے دن صبح کو سب سے پہلے میں نے یہ کام کیا کہ شاستری جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ چوٹی میرے حوالے کیجئے۔ شاستری جی نے چوٹی کاٹ کر نہایت اطمینان سے مجھے عنایت کر دی اس کے بعد سلسلہ شروع ہو گیا اور لوگوں نے بھی اپنی اپنی چوٹیاں کاٹ کر میرے حوالے کر دیں۔ حتیٰ کہ للن جی فیض آبادی...... نے بھی اپنی بڑی بڑی مونچھیں کاٹ کر میرے حوالے کر دیں۔ میں الگ الگ کاغذ میں لپیٹتا جاتا تھا اور ہر ایک کا نام لکھتا جاتا تھا۔ جب ان سب لوگوں سے چوٹیاں اور مونچھیں حاصل کر چکا تو آخر میں اپنے دوست نصراللہ خان کے پاس گیا اور عرض کیا "جناب اب آپ کا نمبر ہے مہربانی فرما کر اپنی داڑھی عنایت کر دیجئے نصراللہ خان صاحب نے گریز کیا تو اب معاملہ دوسرا ہو گیا اور دست بدست و گریبان و پا بدستِ دیگر کی نوبت آ گئی۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں استرا ہاتھ میں لئے۔ وہ کسی طرح داڑھی منڈوانے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ آخر کار جب میں ہر طرح مجبور ہو گیا تو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ نصراللہ خان حسب وعدہ داڑھی منڈوانے کو تیار نہیں۔ حالانکہ ان ہی کی تحریک پر دوسرے حضرات نے اپنی چوٹیاں اور مونچھیں کاٹ کر میرے حوالے کر دی ہیں اگر ان لوگوں نے باہر جا کر یہ بیان دے دیا کہ حضرت مولانا کی موجودگی میں کچھ لوگوں کی چوٹیاں اور مونچھیں کٹ گئیں اور ایک داڑھی نہ منڈھ سکی تو ملک کے لوگ کیا خیال کریں گے۔ مولانا نے فرمایا۔ "ہاں میرے بھائی یہ ہو سکتا ہے"

چنانچہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے نصراللہ خان صاحب کو بلا کر کہا...... "مولوی نصراللہ خان صاحب آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے آپ کے ہاتھ پر غائبانہ بیعت کی ہے تو میرے بھائی داڑھی تو مُنڈ بھی سکتی ہے اور پھر نکل بھی سکتی ہے"

اب مولوی نصراللہ خان صاحب کا برا حال تھا۔ آخر کار داڑھی منڈانا ہی پڑی۔ میں نے ان کی داڑھی کے بال بڑی احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر محفوظ کر لئے۔ داڑھی منڈ جانے کے بعد نہایت خوفناک اور بھیانک چہرہ بر آمد ہوا۔ آج بھی اس کا تصور کرتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے۔ مولانا آزاد نے ان کا چہرہ دیکھ کر مجھ سے کہا تھا...... "خواجہ بجنوری یہ تو بہت ہی بھیانک چہرہ بر آمد ہوا ہے۔ ان کو آئینہ نہ دکھایا جائے۔"

جس طرح جیل کی زندگی بالکل دوسرے انداز کی اور عجیب و غریب ہوتی ہے۔ اسی طرح وہاں کے مذاق بھی کچھ نرالے انداز کے ہوتے ہیں...... میں نے اس واقعہ کی اطلاع مولوی مجید حسن مالک اخبارِ مدینہ بجنور اور اپنے والد صاحب وغیرہ کو دے دی۔ اس اطلاع کے دینے میں مجھے زیادہ دلچسپی اس لئے تھی کہ مولوی نصراللہ خان صاحب کو امامت کا بہت شوق تھا اور جس مسجد میں امام نہ ہوتا وہاں جا کر نماز پڑھانے

کیلئے مستعد رہتے تھے۔ میں ان کی اس مستعدی پر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

ابھی ہم جیل ہی میں تھے کہ گاندھی ارون پیکٹ کی ابتدا ہوئی اور رہائی کی خبریں آنے لگیں۔ نصر اللہ خان صاحب کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے کہ یا اللہ جب تک میری داڑھی پوری نہ بڑھ جائے' رہائی نہ ہو لیکن رہائی نہ رک سکی۔ ہم لوگ تو رہا کر دیئے گئے۔ البتہ مولوی نصر الہ خان کی دعا قبول ہوئی اور وہ ہم سے کچھ دن بعد رہا کئے گئے۔

اب مجھے ان کی رہائی کے بعد بھی اس پُر لطف مذاق کو طول دینے میں لطف آیا۔ داڑھی اور چوٹیاں تو میں اپنے ساتھ لیتا ہی آیا تھا۔ بجنور آ کر کافی پروپیگنڈا کیا کہ اب نصر اللہ خان کو امامت کا موقع نہ دیا جائے۔ جب کہ وہ داڑھی منڈا چکے ہیں۔ لیکن مسجد کی امامت ان حضرت سے کچھ اس طرح متعلق ہو چکی تھی کہ یہ مع اپنی خشخشی داڑھی کے بجنور وارد ہوئے تو پھر منصبِ امامت ان کو سونپ ہی دیا گیا۔ ویسے احباب نے داڑھی کی کافی تعریف کی تھی۔ مولوی نصر اللہ خان نہایت مخلص دوست 'کٹر مذہبی اور بڑے سخت کانگریسی تھے۔

اب جب یہ واقعات یاد آ رہے ہیں تو سوچتا ہوں کہ وہ احباب کیسے زندہ دل اور بے لاگ طبیعت کے مالک تھے۔ ان ہی حضرت نصر اللہ خان کا واقعہ ہے کہ انہوں نے بجنور جیل میں کلام پاکِ حفظ کرنا شروع کیا تھا اور گونڈا جیل میں پہنچ کر پورا کلام پاک حفظ کر چکے تھے۔ بڑے ذہین اور اچھے حافظے کے مالک تھے۔ میں نے ایک روز حضرت مولانا آزاد کی خدمت میں عرض کیا " حضرت یہ کلامِ پاک حفظ کرتے رہتے ہیں بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے " اس پر حضرت نے فرمایا تھا۔ " مولوی نصر اللہ صاحب آپ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ اگر الحمد شریف سمجھ کے پڑھ لو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کلامِ پاک حفظ ہو گیا"

ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل نے آ کر حضرت مولانا ابو الکلام آزاد سے عرض کیا کہ پنجاب کے ایک جج صاحب آپ کے درشن کرنا چاہتے ہیں اور وہ صاحب میرے ساتھ آئیں گے۔ مولانا اس پر مسکرا دیئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت وہ جج صاحب تشریف لائے تو مولانا غسل فرما رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب اور جج صاحب گھومتے رہے مگر مولانا باہر نہ نکلے۔ کافی دیر بعد جب یہ دونوں حضرات چلے گئے تو جگناتھ پرشاد صاحب جو ہمارے جیل کے ساتھی تھے اور جن کو میں چچا ببن خان کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ غسل خانے کی طرف تشریف لے گئے اور غسل خانے کے روشن دان سے اچھل اچھل کر بار بار کہتے رہے۔ " مولانا ٹکٹ چیکر گیا' مولانا ٹکٹ چیکر گیا" کچھ دیر کے بعد مولانا غسل خانے سے باہر تشریف لائے تو ان کا چہرہ غصّہ کی وجہ سے سرخ تھا۔ فرمانے لگے " میرے بھائی میں ان باتوں کا عادی نہیں" ہم سب لوگ بہت پریشان ہوئے اور شرمندگی محسوس کرتے رہے۔ مولانا اپنی بیرک میں تشریف

لے گئے۔ شام کو حسب معمول جب ہماری طرف تشریف لائے تو جگناتھ پرشاد صاحب کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی مولانا نے بڑھ کر کمرے میں قدم رکھا تو یہ دست بستہ معافی کے طلب گار ہوئے۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا۔ "ہاں میرے بھائی وہ وقت تو گزر گیا" اور اس کے بعد دوسری باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ مولانا اس واقعہ کو بالکل بھول گئے ہیں۔

ایک دن نہایت پُرلطف مذاق ہمارے دوست رتن جین بجنوری کے ساتھ کیا گیا۔ یہ بھی وہیں جیل میں تھے۔ جس بیرک میں وہ تھے وہاں اتفاق سے ایک چوہا مر جانے کی وجہ سے وہ بیرک خالی کر دی گئی اور ہماری بیرک کے صحن میں ان لوگوں کے واسطے بھی ڈیرے لگا دیئے گئے۔

ایک دن ان کی اہلیہ محترمہ بجنور سے ملاقات کرنے کے لئے تشریف لائیں اور اپنے ساتھ شکر، اچار اور گھی وغیرہ بہت سا سامان لے کر آئیں۔ ملاقات کے بعد جب رتن لال جی یہ سامان لے کر ہماری بیرک میں پہنچے تو لوگوں کی نظریں اس سامان پر پڑیں۔ ان لوگوں میں مولوی نصراللہ خان اور مسٹر کنچن کشمیری پنڈت جو غالباً جھانسی کے رہنے والے تھے پیش پیش تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے جیل میں پہنچنے سے قبل وہاں گوشت کھانے والوں کی ایک الگ ٹولی بن گئی تھی۔ اور یہ دونوں حضرات گوشت خور ٹولی میں تھے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے یہ کوشش کی کہ اس تفریق کو اس طرح مٹا دیا جائے کہ گوشت کھانا چھوڑ دیں لیکن میری یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ البتہ حضرت مولانا آزاد کے سمجھانے کے بعد گوشت کھانا بند کر دیا یوں ہماری جیل کی خوراک میں گوشت اور انڈا دونوں چیزیں تھیں۔ بہرحال یہ دونوں حضرات ہمارے دوست مسٹر جین سے اسی گروپ بندی کی بنا پر لطف لیتے رہتے تھے۔

اس موقع پر لوگوں کا یہ اصرار تھا کہ کسی طرح اس سامان میں سب کا حصہ ہونا چاہئے چنانچہ اس سلسلے میں میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ میں .... جیلر کو اس امر پر تیار کروں کہ وہ رتن لال جی کو فرضی رہائی کر دیں تاکہ ان کے سامان میں ہم سب شریک ہو جائیں وہ رضامند ہو گئے اور ایک پکّے قیدی کو بھیج کر رتن لال جی کو اطلاع دی کہ شام کو ان کی رہائی ہے۔ رہائی کی اطلاع پاتے ہی ہم سب لوگ ان کے سامان پر ٹوٹ پڑے۔ رتن لال جی سامنے کھڑے ہنستے رہے اور لطف اٹھاتے رہے۔ رہائی کی خوشی کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ اس لوٹ مچائی کا انہیں بالکل خیال نہیں تھا۔

جب یہ سب سامان ختم ہو گیا اور رتن لال جی بھی فرصت پا گئے تو انہوں نے چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا بستر باندھنے کے لئے اوّل سرکاری ڈیرے کی ڈوری کاٹی کیونکہ وہ چمڑے کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ جب بستر بندھ گیا تو ٹرنک میں سے نہایت اُجلا کرتہ اور دھوتی اور ٹوپی نکالی اور زیب تن کی۔ دھوتی کی چنٹیں درست کیں۔ ٹوپی کو ذرا ٹیڑھا کیا گلے میں رومال ڈالا۔ ادھر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ادھر بیرک بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ اب رتن لال جی کی پریشانی بڑھی۔ بار بار بیرک کے دروازے پر جاتے اور دیکھتے کہ پھاٹک سے کوئی میرا سامان لینے کے لئے آ رہا ہے یا نہیں۔ جب انتظار کرتے کرتے

تھک گئے تو ایک پکّے کو پکارا (جیل کی اصطلاح میں پکا وہ قیدی کہلاتا ہے جس کی سزا طویل ہوتی ہے اور جیل میں اس کا چال چلن اطمینان بخش ہوتا ہے) اور اس کے سر پر بستر و ٹرنک رکھ کر پھاٹک کی طرف بغیر جیلر کے کہے روانہ ہو گئے اور پھاٹک پر جا پہنچے۔ اب ہم سب کے سب ساتھی جھانک جھانک کر رخصت ہوتے ہوئے ساتھی کا یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور لطف اٹھا رہے ہیں۔ جب جین صاحب پھاٹک پر پہنچے تو جیلر صاحب اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے رتن لال کو دیکھ لیا لیکن بالکل خاموش رہے۔

ہمارے دوست رتن لال جی پھاٹک پر کھڑے ہوئے جُھک جُھک کر دیکھ رہے ہیں کہ شہر سے جیلر صاحب نے کوئی تانگہ سامان وغیرہ کے واسطے منگایا ہے یا نہیں۔ کیونکہ شہر کی آبادی گونڈا جیل سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے۔ جب پھاٹک بند ہونے کا وقت آیا اور کوئی تانگہ یا دوسری سواری آتی دکھائی نہ دی تو مجبوراً انہوں نے جیلر صاحب سے دریافت کیا...... "جیلر صاحب میرے واسطے کوئی سواری نہیں منگائی گئی" ...... جیلر صاحب نے جواب دیا...... "سواری کیسی؟" جین صاحب نے نہایت اطمینان سے فرمایا...... "میری رہائی آج شام کو ہونے والی ہے آپ کا پیغام پہنچا تھا" جیلر صاحب نے فرمایا...... "معاف کیجئے آپ کی رہائی نہیں بلکہ دوسرے قیدی کی رہائی تھی" یہ جواب سن کر جین صاحب کو بڑا غصہ آیا اور برہم ہو کر کہا "اچھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے ساتھ مذاق کیا گیا اور جیلر صاحب سے کہا کہ اس کی شکایت سپرنٹنڈنٹ جیل سے کروں گا۔ جیلر صاحب نے جواب دیا " آپ لاٹ صاحب سے شکایت کر دیں لیکن آپ جیل کے اندر تشریف لے جائیں" انہوں نے پکّے کو پکارا اور سامان اس کے سر پر رکھوا دیا اور کہا کہ یہ سامان ان کے ڈیرے میں پہنچا دیں۔ اب آگے آگے رتن لال جین صاحب اور پیچھے ان کا سامان۔

ہم سب لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنی اپنی جگہ چلے گئے اور نہایت سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ جب رتن لال بھی بیرک میں واپس تشریف لائے تو غصہ سے ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

جب بیرک بند ہونے لگی اور وہ اپنی جگہ خاموش لیٹ گئے تب میں نے اخبار " پانیر" نکالا اور حسب دستور ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اخبار پڑھ لیجئے۔ اس پر ان سے نہ رہا گیا اور غصہ سے بے تاب ہو کر کہنے لگے...... "لطیف صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا تھا مگر آپ نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا" میں خاموش سب کچھ سنتا رہا۔ خاموشی کے سوا اس وقت چارہ بھی کیا تھا۔ جب یہ قصہ حضرت مولانا کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے بھی خوب لطف لیا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ذہن میں اُبھر آیا۔ جب مولانا ہمارے ساتھ بیرک میں رہ رہے تھے۔ (علیحدہ کمرے میں جانے سے پہلے جس کا ذکر کر چکا ہوں) تو ایک دن مولانا کی خواہش کے مطابق ہر شخص نے گانا سنایا۔ کچھ نہایت خوش گلو تھے اور کچھ بے سُرے۔ مگر کوئی شخص ایسا نہ رہا جو بغیر کچھ سنائے بچا ہو۔ ہمارے دوست مولوی نصر اللہ خان نے بہت اچھا گایا اور سب سے

زیادہ بے سرا میں تھا۔ ہاں تو صرف حضرت مولانا کی ذات ایسی تھی جو ابھی تک گانے میں شریک نہ تھی۔ حاضرین نے مجھ کو اشارہ کیا' میں نے مولانا کی طرف دیکھا فوراً ہی حضرت مولانا نے فرمایا..... "خواجہ بجنوری کیا دیکھ رہے ہو..... " میں نے عرض کیا "مولانا سب کا گانا تو ہو چکا اب یہ سب میری طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ میں آپ سے درخواست کروں"

حضرت مولانا نے فرمایا "مجھے گانا تو نہیں آتا۔ لیکن گانے کے فن پر کچھ کہہ سکتا ہوں" اتنے دن تک حضرت مولانا کی خدمت میں جیل کے اس ماحول میں رہنا نصیب ہوا۔ میں نے کبھی ان کو کروٹ سے لیٹے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی خراٹے لیتے سنا۔ صبح کے چار بجے مولانا بیدار ہو جاتے اور اکثر چادر سے منہ ڈھانپ کر چارپائی کے بیچ میں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ وقت مولانا کے غور و فکر کا ہوتا تھا۔

مولانا جیل میں کسی قسم کی مٹھائی یا پھل نہیں کھاتے تھے بلکہ خشکہ اور دال' سبزی کھاتے تھے لیکن برتن بہت صاف ستھرے ہوتے تھے۔ مولانا کا ٹیفن کیریر اور چائے کا سامان ان کے ساتھ رہتا تھا۔ چائے بڑے اہتمام سے بنائی جاتی تھی۔ باہر سے جو پھل اور مٹھائی وغیرہ مولانا کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ وہ سب چیزیں میرے قبضے میں رہتی تھیں۔ چونکہ مولانا خود تو یہ چیزیں کھاتے ہی نہیں تھے لہٰذا میں اپنے بکس میں ان چیزوں کو تالے میں محفوظ رکھتا تھا۔ ایک دن نصراللہ خان نے مولانا سے شکوہ کیا کہ یہ سب چیزیں خود ہی کھا جاتے ہیں۔ اس پر مولانا نے فرمایا تھا کہ خواجہ بجنوری یہ کیا بات ہے کہ آپ سب چیزیں اکیلے اکیلے کھاتے ہیں' ہونا تو یہ چاہئے کہ سب مل کر کھائیں۔

نصراللہ خان کی یہ شکایت بے جا تھی' کیونکہ میں یہ سب چیزیں تقسیم کر کے کھاتا تھا۔

(لطیف کی کہانی صفحہ 65 تا 76)

مولانا نصراللہ خان عزیز بڑے نامور صحافی اور سیاستدان تھے انہیں گونڈا جیل میں چند ماہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ گزارنے کا اتفاق بلکہ سعادت حاصل ہوئی وہ اپنے تاثرات اور مشاہدات بیان کرتے ہوئے مولانا کی عبادت گزاری پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ہماری بارک میں جیسا کہ جیل کی بارکیں ہوتی ہیں' چاروں طرف دَر بنے ہوئے تھے جن میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور سرد یا گرم ہوا بڑی تیزی سے بارک میں داخل ہوتی تھی۔ گرمیوں کی لُو اور سردیوں کی یخ بستہ ہوا کو روکنے کے لئے ہم جیل کے کمبلوں کے پردے تان لیتے تھے لیکن بہرحال موسمی اثرات سے چارہ نہیں تھا چنانچہ جس زمانے میں مولانا ہمارے درمیان رہے سخت سردی پڑ رہی تھی۔ یہ دسمبر کے اواخر اور جولائی کے اوائل کا زمانہ تھا کنواں بارک سے باہر تھا اور ہم اپنی ضروریات کے لئے پانی سے گھڑے میں بھر کر رکھ لیتے تھے جو فجر کے وقت یخ بستہ ہو جاتا تھا۔ مولانا اسی سخت ٹھنڈے پانی سے فجر کی نماز کے لئے وضو کرتے تھے۔ چونکہ انہیں نزلے کا مستقل عارضہ تھا اور اعضائے وضو زیادہ دیر تک تر رہنے سے بیمار ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے وضو کرتے وقت تولیہ پاس رکھ لیتے تھے جس عضو کو دھوتے اس کو تولئے سے پونچھ لیتے تھے' منہ دھو کر منہ کو' ہاتھ دھو کر ہاتھ کو اور

پاؤں دھو کر پاؤں کو خشک کر لیتے تھے پھر دوسرا دھوتے تھے۔ مولانا نصر اللہ خان عزیز مزید کہتے ہیں کہ میں نے مولانا کو تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ آخر شب میں جب بھی آنکھ کھلی ان کو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے اس انداز میں دیکھا کہ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں' چائے کے لئے سٹوو گرم ہوتا' انگلیوں میں سگریٹ اور سر جھکا ہوا' کسی کسی وقت کش لیتے اور جب سگریٹ ختم ہو جاتا تو دوسرا سلگا لیتے۔ مولانا چین اسموکر تھے۔ اسی دوران چائے بھی پیتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی بالکل سادہ تھی' نہ لباس میں تکلّف اور نہ کھانے پینے میں.............

ترجمان القرآن

انتساب اور دیباچے

جیسا کہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے قرآن حکیم کا ترجمہ اور تفسیر نئے انداز اور عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق لکھنے کی آرزو اور ارادہ مولانا کا بہت دیرینہ تھا۔ اس کے اسباب و وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے دیباچہ طبع اوّل میں لکھتے ہیں:۔

> ''چوتھی صدی ہجری کے بعد علومِ اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا' اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ 'تقلید کی شاہراہ ہو گئی۔ اس داءِ عُضال نے جسمِ تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا' کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے' تو ضروری نہیں کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کر لے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداوّل تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں' بیضاوی اور جلالین کے حاشئے دیکھو' ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوتِ تصنیف رائیگاں گئی ہے؟''

یہ اور اس کے علاوہ دیگر کئی محرکات تھے جو ترجمہ و تفسیر لکھنے کا سبب بنے ان کا تذکرہ دیباچہ اوّل میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''..... مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔''

چنانچہ قرآن کی عظمت اور اس کے اصل مقام سے مسلمانوں کو روشناس کرانے کا بیڑا انہوں نے

اٹھا" اور " البلاغ " نومبر 1915ء کے شمارے میں اعلان کیا کہ قرآن حکیم کی تعلیمات کریمہ کے جو حقیقی معارف وبصائر تھے اور جن مقاصدِ عظمیٰ کے لئے اس کا نزول ہوا تھا۔ وہ صدیوں سے بھلا دیئے گئے ہیں اور یقیناً وہ وقت آ گیا ہے جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ قرآن کے انوار وبرکات زمین سے اٹھا لئے جائیں گے اور جب لوگ تلاوت کے لئے صحائف کھولیں گے تو اس کے اوراق کو بالکل سادہ وغیر منقوش پائیں گے۔ اس اعلان سے تشنہ کام مسلمانوں میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن ایسے حوادث پیش آئے کہ " ترجمان القرآن " کی پہلی جلد کی اشاعت 1931ء تک ممکن نہ ہو سکی۔ اس تاخیر کی تفصیلات اور عوامل کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ حالانکہ دیباچہ طبع اوّل کے مطابق " جب " البلاغ " میں اعلان شائع ہوا تھا تو ترجمہ اور تفسیر پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا......" لیکن ناگزیر وجوہات کے باعث یہ سلسلہ 20 جولائی 1930ء تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ابھی اسے طباعت واشاعت کے مراحل سے گزر کر شایقین کے ہاتھوں تک پہنچنا تھا کہ مولانا اس عظیم کام کی تکمیل کے پورے ایک ماہ بعد 21 اگست 1930ء کو نمکین ستیہ گرہ کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا دیباچہ ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں 16 نومبر 1930ء کو لکھا۔

ترجمان القرآن جلد اوّل کا انتساب مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہے یہ مسوّدہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نیو دہلی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ " ترجمان القرآن " جلد اوّل کا دوسرا دیباچہ " دیباچہ طبع ثانی " کے عنوان سے قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں 7 فروری 1945ء کو لکھا گیا۔

25 فروری 1931 کو گورنر جنرل نے وزیر اعظم برطانیہ کے بیان کی روشنی میں ایک اعلان جاری کیا۔ جس کے ذریعے کانگریس کو خلافِ قانون قرار دینے کا حکم واپس لے لیا گیا۔ یکم جنوری 1930ء کے بعد سے مختلف اوقات میں ورکنگ کمیٹی کے گرفتار شدگان اراکین، عہدیداران، گاندھی جی اور دیگر کو رہا کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ یہ کارروائی گاندھی جی اور گورنر جنرل کے درمیان افہام وتفہیم کے نتیجے میں عمل میں آئی۔ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ جیکار نے اہم کردار ادا کیا۔ عفوِ عام کے اعلان تک مولانا تقریباً چھ ماہ کی سزا کاٹ چکے تھے۔ وہ 27 جنوری 1931ء کو رہا کئے گئے۔ خان عبدالغفار خان اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کی رہائی پر حکومت متامّل تھی۔ گاندھی جی کی دھمکی سے خان عبدالغفار خان تو رہا کر دیئے گئے لیکن مولانا حبیب الرحمان سزا پوری کرنے پر ہی رہا ہوئے۔ سالٹ ستیہ گرہ میں پندرہ ہزار سے زائد مسلمانوں نے رضاکارانہ گرفتاریاں پیش کیں۔

انتساب

غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا، تو مجھے محسوس ہوا، کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا:

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انہوں نے نوکر رکھ لیا، اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں"۔

"افسوس، تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال، اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے"۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا، اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اُسے اندیشہ تھا، میں اُسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اُسے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی، تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔

۱۲ ستمبر، ۱۹۳۱ء

کلکتہ

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری میں محفوظ "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد کے مسودے کا پہلا صفحہ۔ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔

چوتھی گرفتاری

۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء

گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے خالی ہاتھ واپس لوٹے تب برطانوی سرکار نے صلح جُو گورنر جنرل لارڈ اِروِن کو ہٹا کر اس کی جگہ غیر مفاہمت پسند سخت گیر گورنر جنرل لارڈ ولنگڈن مقرر کر دیا کیونکہ اب حکومت زیادہ سخت رویہ اختیار کر کے ہندوستانیوں کو دبانے کی پالیسی اپنانا چاہتی تھی۔ گاندھی نے جونہی ساحلِ بمبئی پر قدم رکھا گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی پکڑ دھکڑ کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا آزاد اور دیگر سرکردہ کانگریسی رہنما اور سرگرم عناصر جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ مولانا کہتے ہیں:
"میں دہلی میں تھا اور مجھے یہاں ایک سال سے زیادہ حراست میں رکھا گیا" (ہماری آزادی ص 30)
عبداللطیف اعظمی یہ مدت دو ماہ بتاتے ہیں۔ جو 12 مارچ 1932ء سے 11 مئی 1932ء تک کی ہے (ایوان اردو دہلی 6 دسمبر 1988ء ص 42)

لارڈ ولنگڈن گورنر جنرل بنے تو مسٹر جناح گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ نئے گورنر جنرل کے تقرر کا سن کر ہندوستان واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ جب لارڈ ولنگڈن بمبئی کے گورنر تھے تو مسٹر جناح اور گورنر کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ گورنر کے یہاں ایک ضیافت میں مسٹر اور مسز رتی جناح دونوں مدعو تھے۔ مسز رتی جناح نے نیم پردہ دار لباس زیب تن کیا ہوا تھا اس کا زیادہ عریاں ہونا لیڈی ولنگڈن کو گراں گزرا اس نے عریانی ڈھانپنے کے لئے ایک شال مسز جناح کے

کندھوں پر ڈال دی۔ لیڈی ولنگڈن کی اس حرکت پر مسز جناح تاؤ میں آ گئیں اور میاں بیوی ضیافت سے اُٹھ کر چلے گئے۔

پانچویں گرفتاری

جنوری ۱۹۴۱ء

مولانا کانگریس کے صدر تھے گاندھی جی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر رکھی تھی جس کا مقصد جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا تھا۔ اس مسئلہ پر گاندھی جی اور مولانا آزاد کے درمیان اختلاف تھا۔ مولانا جنگ کے خلاف اس سے زیادہ وسیع اور زیادہ شدید تحریک چلانے کے حق میں تھے۔ ونوبھاوے پہلے انفرادی ستیہ گرہی تھے پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنا نام رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔ گاندھی جی نے ان کی پیشکش بھی قبول کر لی اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

انفرادی ستیہ گرہ گاندھی جی کی رہنمائی اور نگرانی میں چل رہی تھی۔ پنجاب کانگریس کے سردار سمپورن سنگھ نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کی اجازت حاصل کئے بغیر ستیہ گرہ کی اور گرفتار ہو گئے۔ سردار جی نے کانگریس کی واضح ہدایات کے خلاف عدالت میں صفائی پیش کی۔ مجسٹریٹ نے انہیں مجرم قرار دے کر ایک آنہ جرمانہ کی سزا دی اور اس کو اپنی جیب سے ادا کر دیا اور سردار جی رہا ہو گئے۔ اس سے تحریک کی ہوا خیزی ہوئی معاملہ کو سلجھانے کی خاطر مولانا آزاد کو پنجاب آنا پڑا۔ مولانا پنجاب سے واپس جا رہے تھے کہ الہ آباد ریلوے سٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔ وہ صبح کی چائے پینے کے لئے ریفرش منٹ روم میں جا رہے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آداب و تسلیمات کے ساتھ وارنٹ گرفتاری پیش کیا۔ مولانا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "آپ نے مجھے یہ خاص اعزاز دیکر بڑی عزت بخشی ہے' آپ مجھے گرفتار کر رہے ہیں جبکہ مجھے انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے" مولانا کو دو برس کی سزا دے کر نینی

جیل میں بند کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے پھوٹ پڑنے کے صرف ایک ہفتہ بعد مجلسِ احرار نے جنگ میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر دیا اور "چندہ دیں گے نہ بندہ" کا نعرہ بلند کیا۔ احرار کا فیصلہ اور جنگ بازی کے خلاف مہم برطانوی استعمار کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ احرار پر حکومت کا عتاب نازل ہوا اور گرفتاریوں کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کرنے کا فیصلہ نہ کیا تھا اور گاندھی جی ابھی اس بارے میں غور ہی کر رہے تھے۔ احرار تنہا یہ جنگ لڑ رہے تھے اور صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ کسی دیش بھگت کو ہمدردی کے دو بول کہنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

احرار سب پر سبقت حاصل کر چکے تھے۔ وہ صفائی پیش کرنے سے انکار کرتے اور طویل المیعاد سزائیں قبول کر کے جیلوں میں چلے جاتے۔ جنگ کے خاتمہ تک یہ جیلوں میں بے داد پڑے رہے۔ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی واردھا گئے۔ جہاں انہوں نے مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو سے احرار سول نافرمانی کے مسئلہ پر گفتگو کر کے کانگریس کی تائید حاصل کرنا چاہی ـــــ کانگریس کے دونوں رہنماؤں نے احرار کی سول نافرمانی کو سراہا اور تائید کی۔ مولانا آزاد نے مشورہ دیا کہ احرار سول نافرمانی کو گاندھی جی کی رہنمائی میں دے دیں اور گاندھی جی اعلان کریں کہ احرار سول نافرمانی جس میں ہزاروں رضا کار جیل جا چکے ہیں وہ گاندھی جی کے پروگرام کے مطابق سول نافرمانی سمجھی جائے۔ احرار کے قائدین نے قیامِ واردھا کے دوران میں گاندھی جی سے ملنے کی بہت کوشش کی تاکہ مولانا کا فارمولا گاندھی جی کو پیش کیا جا سکے لیکن بدقسمتی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کے فرزند مولانا عزیز الرحمان لکھتے ہیں کہ پنجاب کانگریس کے لیڈر میاں افتخار الدین اور ڈاکٹر گوپی چند کے اشارے پر گاندھی جی کے سیکرٹری مسٹر پیارے لال نے ملاقات نہ ہونے دی اور مولانا کا فارمولا گاندھی جی تک پہنچانے سے انکار کر دیا۔ دراصل کانگریس کے دونوں پنجابی نیتا احرار سے پرخاش رکھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ احرار سول نافرمانی کی باگ ڈور گاندھی جی اپنے ہاتھ میں لے کر احرار کی مزید شہرت اور تقویت کا باعث بنیں۔ احرار پہلے ہی پنجاب میں مضبوط تھے، اس صورت میں مزید مستحکم ہوتے۔ دراصل پنجاب کے کانگریسی احرار کو اپنا حریف تصور کرتے تھے۔

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے اپنی کوششیں جاری۔ انہوں نے مولانا آزاد سے ملاقات کی اور طے پایا کہ گاندھی جی اور مولانا آزاد یکم جنوری 1941ء تک احرار سول نافرمانی کے حق میں اعلان کر دیں گے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق احرار کی تحریک سول نافرمانی کے متعلق مولانا آزاد اور مولانا حبیب الرحمان کے درمیان نہایت اہم فیصلے ہوئے۔ احرار نے اپنی سول نافرمانی گاندھی جی کے سپرد کر دی اور طے پایا کہ آئندہ پنجاب میں احرار گاندھی جی سے پروگرام لیکر سول نافرمانی کریں گے۔

یورپ اور ایشیا میں جنگ نے شدت اختیار کر لی۔ جون میں جرمنی نے جنگ نہ کرنے کے معاہدہ

کو بالائے طاق رکھتے ہوئے روس پر حملہ کر دیا۔ جرمن افواج آندھی کی طرح آگے بڑھ رہی تھیں۔ 2 دسمبر 1941 کو جرمنی کی وزارتِ اطلاعات و نشریات نے تمام اخباروں کے ایڈیٹروں کو حکم دیا کہ سقوطِ ماسکو کی خبر کے لئے صفحہ اول پر جگہ خالی رکھیں لیکن سردی کے خلافِ توقع قبل از وقت شروع ہونے کے باعث جرمنی کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا اور جرمن افواج کی نہ صرف پیش قدمی رک گئی بلکہ اسے بے شمار جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

ایشیا میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر کے امریکہ کے اٹھاسی ہوائی جہاز تباہ کر دیئے اور ایک سو انہتر کو ناکارہ بنا دیا۔ سمندر میں کھڑے اٹھارہ بحری جہاز ڈبو دیئے۔ اس صورتِ حال پر امریکی حکومت کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے حکومت برطانیہ پر پہلے سے زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ہندوستان کے مسئلے کو طے کرے اور خوشی سے جنگ کی مساعی میں شامل کرنے پر آمادہ کرے۔ صدر روز ویلٹ نے ہندوستانی لیڈروں کی شکایات کو دور کرنے کے لئے دباؤ ڈالا۔ چنانچہ حکومت نے 4 دسمبر 1941ء کو مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کو رہا کر دیا۔

مولانا کی اسارت کا تقریباً ایک سال نینی سنٹرل جیل میں بسر ہوا۔ ان کے ساتھ ملک کے نامور صحافی اور سیاستدان مولانا محمد اسماعیل ذبیح بھی یہیں مقید تھے۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ نینی سنٹرل جیل میں ایک سال" اس میں انہوں نے مولانا کی روز مرّہ زندگی، سیرت و اخلاق اور فکر پر روشنی ڈالی ہے۔ دراصل یہ ان کے مشاہدات پر مشتمل داستان ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

میں اپنی زندگی کا سب سے مسرور اور کامیاب حصہ ان قیمتی دنوں کو شمار کرتا ہوں جو میں نے نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں گزارے اور اس کا بڑا سبب مولانا ابو الکلام آزاد کی قابلِ فخر رفاقت تھی۔

مولانا آزاد کی ادبی اور علمی عظمت سیاسی اختلاف رائے کے باوجود تاریخی ورثہ بن چکی ہے۔ عام حالات میں تو ان سے تھوڑی دیر کی ملاقات بھی میسر آنا مشکل ہے تاہم یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان کے ساتھ کامل ایک سال تک رہنے کا اتفاق ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ مولانا کے شب و روز کا ہر حصہ عیاں تھا اور ان کے معمولات کا گوشہ گوشہ سب قیدیوں کے سامنے رہتا تھا۔ مولانا کی فطری کم آمیزی اور تنہا پسندی اگرچہ جیل کی زندگی میں بھی بڑی حد تک برقرار رہی لیکن 1940ء کا طوفانی زمانہ ہٹلر کے مسلسل فاتحانہ اقدامات اور ہندوستان کے انقلاب انگیز اقدامات ایسے تھے کہ مولانا کو ساتھی قیدیوں نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سیاسی بصیرت، علمیت اور وسیع مطالعے اور تبصرے سے نوازیں اور اپنے ساتھیوں کی سیاسی تربیت میں پختگی پیدا کریں۔

1940ء کے آغاز میں ہی اکثر صوبوں کی کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو چکی تھیں اور بعد کو گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک میں شریک ہو کر تمام کانگریسی وزراء، ممبرانِ اسمبلی لیڈر اور خاص خاص

کارکن جیلوں میں بھر گئے تھے۔ مولانا آزاد ان دنوں کانگریس کے صدر تھے اور نینی جیل میں نظر بند کئے گئے تھے۔

مجھے اٹاوہ یوپی میں ایک باغیانہ تقریر کے جرم میں ایک سال کی سزا دی گئی تھی اور میرا تبادلہ نینی سنٹرل جیل کر دیا گیا تھا اس تحریک میں قید ہونے والے بی اور اے کلاس کے قیدیوں کو یوپی کی دو سب سے بڑی جیلوں نینی سنٹر جیل الہ آباد اور فتح گڑھ سنٹرل جیل میں جمع کر دیا گیا تھا۔ نینی سنٹرل جیل پنجاب کے ملتان سنٹرل جیل سے بھی بڑی ہے جہاں نہ صرف مولانا آزاد ہی قیام فرما تھے بلکہ مسٹر ٹنڈن وجے لکشمی پنڈت 'ڈاکٹر کاٹجو ودیگر وزراء بھی موجود تھے۔

کل سیاسی قیدیوں کی تعداد سو سے بھی زائد تھی اور یہ سب کے سب ممتاز اہلِ علم اور یوپی کی کانگریسی تحریکات کے منتخب اشخاص تھے۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسران کے ساتھ ایسے ممتاز طلبہ کی بھی بڑی تعداد قید تھی جو انقلابی تحریکات کو چلانے کے ملزم قرار دیئے گئے تھے۔

اس وقت ہندوستان کی سنٹرل گورنمنٹ میں جو وزراء ہیں ان میں یوپی کے رہنے والے تمام اکثر اصحاب نینی میں موجود تھے۔ البتہ مسلمان قیدیوں کی تعداد چھ سات سے متجاوز نہ ہو سکی۔ میرا خیال ہے کہ جس قسم کے اشخاص نینی جیل میں جمع کر دیئے گئے تھے وہ علمی لحاظ سے کئی یونیورسٹیوں کا مکمل سٹاف بننے اور سیاسی لحاظ سے کئی صوبوں کی وزارت چلانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ میں نے اتنا رنگارنگ علمی وسیاسی اجتماع اپنی زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا اور نہ اب ایسا اجتماع ممکن ہے۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت کا اعتراف جس طرح اور قیدیوں نے کیا اور جو رُعبِ عظمت ان حضرات پر مولانا کا قائم ہوا وہ دیکھنے کی چیز تھا۔ ہندو یونیورسٹی بنارس کے بڑے بڑے پروفیسران ہمیشہ مولانا کو مہاودوان کہتے تھے اور جب مولانا سے وہ گفتگو کرتے تو مولانا کی سحر طراز فصاحت و بلاغت کو آسنکارک بھاشا(علاقائی)زبان قرار دے کر حیران ہو جاتے۔ میں نے جب ان پنڈتوں اور پروفیسروں سے مولانا کے متعلق پوچھا تو بالاتفاق ان کی رائے یہی ہوئی کہ ہم نے جس موضوع پر بھی مولانا سے گفتگو کی وہ ہم کو اتھارٹی محسوس ہوئے۔ وہ گیان اور بدّیا کے مہاساگر ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہندوستان کے موجودہ وزیر ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو جو مولانا کے ساتھ ہی گول چکر کی بارک میں رہتے تھے۔ مولانا سے مسائل جنگ کے علاوہ ہندوستانی سیاست اور ہندو مسلم معاملات پر بھی طویل بحث کرتے تھے اور ان دونوں کی معرکۃ الآرا گفتگو سننے کے لئے چپ چاپ اچھا خاصہ مجمع لگ جاتا تھا مگر آخر میں ڈاکٹر کاٹجو صاحب مولانا کے دلائل تسلیم کر لیتے تھے۔ ایک چیز جس پر ڈاکٹر کاٹجو اور مولانا آزاد میں اتفاق رائے کبھی نہیں ہو سکا وہ آزاد ہندوستان میں زبان کا مسئلہ تھا۔ مولانا اس ہندوستانی کو قومی زبان بنانے پر اٹل تھے جو ایک طرح بولی جاتی مگر دیوناگری اور فارسی تحریروں میں لکھی جاتی ہے۔ کاٹجو صاحب ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی کو بنانا چاہتے تھے۔ جس کا رسم الخط بھی صرف دیوناگری ہو مگر اس وقت ان کی

یہ فراخدلانہ پیشکش بھی تھی کہ اردو کو بہر حال ہندی کے بعد دوسرا درجہ دیا جائے گا اور سرکاری کاموں میں چاہے لاکھوں روپیہ کا مزید صرف کیوں نہ ہو اردو کو اہم حیثیت حاصل ہو گی اور اس پر بھی تیار تھے کہ ہندوستان کا دستور اور تمام آئینی کارروائیاں بھی اردو میں ہوں۔

اسی طرح مولانا آزاد نے ہٹلر کی فتح کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ اس جوش و خروش کے دنوں میں بھی جب کہ روس جرمنی کا حلیف تھا اور سارا یورپ پکے ہوئے پھل کی طرح ہٹلر کے قدموں میں گر رہا تھا دو باتوں کی بڑے یقین سے پیش گوئی کرتے تھے اوّل یہ کہ روس اور جرمنی کی عارضی صلح ختم ہوا چاہتی ہے اور جب یہ صلح ختم ہو کر روس اور جرمنی میں گھمسان کا رن پڑا تو مولانا روس اور برطانیہ کی کامیابی کے ایسے ٹھوس دلائل دیتے تھے جو ان دنوں اگرچہ یقین میں نہیں آتے تھے مگر بعد میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے مگر انگریزوں کے طرزِ مدافعت اور تابِ مقاومت کو بہت سراہتے تھے اور ہٹلر کے متعلق ان کا فیصلہ تھا کہ وہ خود رائی سے کام لے کر جنگ ہار جائے گا۔

مولانا نے کبھی اس امکان پر بحث ہی نہیں کی۔ جرمنی جنگ جیت کر ہندوستان کو مدد دے سکتا ہے وہ فرماتے تھے کہ اس لڑائی کا انجام بہر حال ہندوستان کی آزادی ہو گا۔

جن دنوں ہٹلر طوفانی انداز میں کاکیشیا کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہر لحظہ اس کا امکان تھا کہ ترکی پر بھی نازیوں کا تسلط ہو جاوے اس وقت ہر طبقے کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد مولانا کے پاس جمع ہو جاتی تھی اور ان سے نقشہ جنگ کی وضاحت کی درخواست کرتی۔ مولانا پہلے تو حسبِ معمول ٹالتے مگر پھر روزانہ کے مطابق نقشہ جنگ پر تقریر کرتے ان کی تقریر میں سابقہ تاریخ جغرافیائی حالات، موسم اور دونوں فریقوں کے لئے مشکلات کا مکمل جائزہ ہوتا۔ مولانا نے جب کاکیشیا کی سابقہ تاریخ، آتش پرستوں کے ابتدائی عقیدہ کا مآخذ، کاکیشیا کے مختلف درّوں اور ان سے کتنی اقوام گزری ہیں ان کی تفصیل اور نقشہ جنگ میں نازیوں کو پیش آنے والی دشواریاں بیان کیں تو ان کے دلائل و معلومات اتنے حیرت انگیز تھے کہ کئی فاضل پروفیسروں نے مولانا کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ ان کو آج ہی بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مولانا جیل میں تبصرۂ جنگ کے سب سے بڑے ماہر مانے جاتے تھے۔

اگرچہ آج ہندوستان کا ماحول کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ بعض لوگ جن کو سنٹرل جیل میں مولانا کے رُعب کے سامنے زبان کھولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی اور جو مولانا کے سامنے احساسِ کمتری کا مجسمہ بنے رہتے تھے اب وہ مولانا پر اس انداز میں تنقیدیں کر رہے ہیں جیسے کہ ان میں اور مولانا میں کوئی فرق نہیں رہا ہے لیکن جیل کے ماحول میں ان کی حیثیت ادنیٰ چیلے کی سی تھی۔

راج رشی ٹنڈن جی بھی نینی جیل میں موجود تھے مگر انکو مولانا آزاد سے کسی مسئلہ پر بحث کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ ان کا جیل میں صرف ایک مشغلہ تھا کہ وہ ہر وقت اپنے پاس گنا بیلنے کی ایک چھوٹی مشین رکھتے تھے اور بجائے غذا استعمال کرنے کے گنے کے تازہ رس پر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈال رہے تھے

لال بہادر شاستری، کیشنو ، مالویہ پنڈت بال کرشن شرما، سی بی گپتا اور ہندوستانی حکومت کے کئی موجودہ وزراء اور ممبران پارلیمنٹ جو نینی جیل میں تھے ان میں کسی کو بھی مولانا سے بات کرنے کی ہمّت نہیں پڑ سکی وہ مولانا آزاد کو ایسی بلند چوٹی سمجھتے تھے جس کو عبور نہیں کیا جا سکتا صرف دُور سے دیکھا جا سکتا ہے مسز وجے لکشمی پنڈت میں اپنے بھائی جواہر لال نہرو کا سا بانکپن بلکہ تیکھا پن ہے وہ بھی چند ماہ نینی جیل میں رہیں اور جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر جنرل اوبرائے کے نام اپنی کتاب موسوم کر کے چلی گئیں مگر سارے قیدیوں کو خاطر میں نہ لانے کے باوجود مولانا آزاد کے احترام و عقیدت میں کبھی بھی کوئی فرق انہوں نے نہیں کیا۔

نینی سنٹرل جیل کے اخلاقی قیدی مولانا آزاد کو بادشاہ کے نام سے پکارتے تھے اور سیاسی قیدی حضور کے لقب سے۔

مولانا آزاد کا معمول تھا کہ وہ صبح ہر موسم میں 4 بجے اٹھتے اور جس طرح بھی ان کو سامان میسر ہوتا ٹرکش اسٹائل کا غسل کرتے، پابندی سے نماز بہ آواز بلند پڑھتے، تلاوتِ کلام مجید کرتے اور تھوڑا بہت وظیفہ بھی پھر ان کی مرغوب و محبوب سبز چائے کا دور شروع ہو جاتا صبح کی کرنوں کی آمد کے ساتھ ہی وہ تنہا جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے اور صف بستہ عقیدت مند ساتھیوں کو خندہ پیشانی سے دعا سلام کہتے چلے جاتے۔ پھر اس کے بعد جم کر کتابوں کا مطالعہ کرتے دس بجے اخبارات آجانے کے بعد سارے جیل میں روز زبردست شور مچ جاتا تھا پہلے پڑھنے کے شوق میں اکثر اخبارات پھٹ بھی جاتے تھے۔ مولانا اس شور سے الگ اپنے حصے کے اخبارات سکون سے پڑھتے اور پھر امروزہ اخباری مباحث کی مجلس لگ جاتی پھر دوپہر کو انتہائی مختصر اور سادہ سا کھانا کھا کر کچھ دیر سوتے اور نمازِ ظہر سے عصر تک کتابوں کا مطالعہ کرتے، عصر سے مغرب تک وہ قیدیوں کے اسپورٹس کا جائزہ لیتے، رات کو دس گیارہ بجے تک ان کا مطالعہ جاری رہتا۔ مولانا جس بارک میں رہتے تھے عام اخلاقی قیدی اس کو کتا بارک کہتے تھے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ جن دنوں اس میں کوئی بادشاہ قسم کا سیاسی قیدی نہیں رہتا تھا ان دنوں جیل کے حکام سرکش اخلاقی قیدیوں کو اندر بند کر کے اس طرح پیٹتے تھے جس طرح کتے کو کمرہ میں بند کر کے مارا جائے۔

نینی جیل کے وسیع حصار کے اندر یہ چھوٹی سی گول بنگلہ نما بارک ہے جو بڑی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی ہے یہ ابتدا میں پنڈت موتی لال نہرو کے لئے بنائی گئی تھی اس کے بعد اس میں پنڈت مالویہ اور جواہر لال بھی رہے اور سب سے آخر میں مولانا آزاد نے اس کو رونق بخشی۔

مولانا آزاد آلو کے نمکین سموسے، سبز چائے اور سگریٹ کے خاص شوقین ہیں، مٹھائی سے ان کو رغبت نہیں ہے ہم بی کلاس کے قیدیوں نے اپنی جداگانہ میس بنائی تھی اور بڑے لذیذ کھانے و پکوان پکائے جاتے تھے مگر مولانا اسپیشل کلاس کے قیدی ہونیکے باوجود اچھی خوراک سے ہمیشہ محروم رہے، ان کو کام کے لئے جو قیدی مہیا کئے گئے تھے وہ نہ وقت پر چائے تیار کر پاتے تھے اور نہ کھانے کے ذائقے کا ان کو علم تھا۔ مولانا کے تمام راشن یہ ہڑپ کر جاتے تھے، مولانا کی طبع غیور میں ان قیدیوں کی شکایت کرنا حرام تھا، تمام

سال مولانا نے تکلیف دہ یہی کچاپکا کھانا کھا کر گزار دیا مگر اُف تک نہ کی۔

مولانا جیل کے قاعدوں کے اس سختی سے پابند تھے کہ کبھی بھی ان میں نرمی یا کسی خاص رعایت یا جیل کی اصطلاح میں تگڑم کی انہوں نے کوشش نہیں کی جیل سپرنٹنڈنٹ اوبرائے خود صاحبِ ذوق اور عالم شخص تھا اور نہرو خاندان سے اس کی قرابت داری تھی مگر مولانا نے اس کی نیازمندی کے باوجود اپنی ذات کے لئے اس سے کوئی بات نہیں کی اور نہ مولانا نے اپنے کسی ساتھی کو اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کوئی اشارہ کیا۔

مولانا مجھ پر کچھ مہربان تھے اس لئے انہوں نے صرف مجھ کو یہ اعزاز بخشا کہ جب ان کے ملاقاتی تین سے زائد کی تعداد میں آتے تو باقی ملاقاتی مجھ سے ملنے کی اجازت حاصل کر لیتے اور چونکہ سب ملاقاتیں اکٹھا ایک ہی کمرے میں ہوتی تھیں اس لئے میرے نام سے آنے والے بھی مولانا سے شرفِ ملاقات حاصل کر لیتے اور جب کبھی ایسا ہوتا تو مجھ سے ملنے والے ملاقاتی مولانا کے لئے جو تحائف لاتے وہ مولانا بہ اصرار مجھ کو بخش دیتے۔ اگرچہ میں پابندی سے سبز چائے اور سگریٹ مولانا کو واپس کر آتا ان ملاقاتوں میں مجھے اچھے اور معیاری تحفے ملنے لگے جو جیل کے ساتھیوں میں "تبرکاً" تقسیم ہو جاتے تھے۔

ہم قیدیوں کا معمول تھا کہ رات کو جب اپنی اپنی طویل بارکوں میں بند ہوتے تو رات کا کھانا کھانے کے بعد نئے نئے ڈرامے کھیلتے اور پھر ہنسی کا ایسا طوفان کھڑا کرتے کہ دور ایک ایک میل تک شور پہنچ جاتا۔ اس کے بعد تاش کی بیسیوں پھڑیں لگتیں جو رات کے دو بجے تک ہنگامہ قائم رکھتیں۔ جیل کے افسران ہم سے تنگ تھے اور مولانا سے اس کی شکایت کرتے۔ مولانا اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ "سیاسی قیدی اگر اپنی میعادِ قید کو ہنسی میں نہ اڑائیں تو کیا کریں۔" اس جواب سے جیل والے خاموش ہو جاتے' ایک دفعہ ہم لوگوں کو کیا سوجھی کہ رات کو مختلف اقسام کے رونے کی بازی لگ گئی۔ مختلف پارٹیوں نے طرح طرح کے رونے ایجاد کئے اور اس طرح روئے گویا کہرام برپا ہے جیل والے اس خلافِ معمول حرکت سے پہلے تو بھاگے ہوئے آئے اور جب ان کو درمیانی قہقہوں سے ہم لوگوں کی درپردہ شرارت کا اندازہ ہوا تو دوسرے دن صبح ہی مولانا سے پُرزور شکایت کی اِس بار مولانا نے مداخلت کی اور ہم لوگوں سے کہلا بھیجا "دشمن کی قید میں ہنسی ہنسی میں بھی رونا اچھا نہیں ہے" اس مختصر سے معنی خیز جملے نے کافی اثر کیا اور آئندہ کے لئے یہ فرمائشی گریہ بند ہو گیا۔ جیل میں مولانا اپنی بارک کے سوا دوسرے قیدیوں کے پاس نہیں جاتے تھے البتہ عید یا ہولی' دیوالی کے تہواروں میں وہ قیدیوں کی ان تقریبات میں شریک ہوتے تھے جو بڑے تکلّف و شان و شوکت سے کی جاتی تھیں۔

جیل میں بالعموم تنقید و تبصرے بلکہ فضول گوئی کی بھی کافی فرصت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا نے کبھی ایک لفظ بھی اپنے سیاسی حریف یا مخالف مسلم رہنماؤں کے متعلق نہیں کہا۔ مولانا شخصی آزادیٔ رائے کو اس حد تک عزیز رکھتے ہیں کہ وہ اختلاف رائے کو کبھی بھی بدنیتی پر محمول

ہی نہیں کرتے اور نہ کبھی وہ کسی بھی مخالف کو ذاتی الزام کا ہدف بناتے تھے۔ جیل میں سینکڑوں ایسے فاضل عالم قیدی تھے جنہوں نے اپنے گھر یا یونیورسٹی کی لائبریری سے مختلف علوم کی بہترین کتابیں منگائی ہوئی تھیں مگر حیرت ہے مولانا نے ان کتابوں میں سے شاذونادر ہی کسی کتاب کا مطالعہ کیا ہو۔ جب ان سے ان ہمہ قسم کتابوں کے متعلق پوچھا تو مولانا یہی جواب دیتے "ہاں میرے بھائی! میں ان کو پڑھ چکا ہوں"

مولانا کے لئے دور دراز سے کتابوں کے تحفے آیا کرتے تھے۔ پروفیسر محمد اجمل خان کا تو کام ہی یہی تھا کہ وہ مولانا کی پسند کی کتابیں جمع کر کے بھیجتے رہیں۔ میں نے ان کتابوں کو کئی بار دیکھا۔ ان میں مطبوعہ کتابیں تو صرف فرانسیسی اور انگریزی زبان کی ہوتی تھیں لیکن عربی و فارسی کی کتابیں صرف قلمی نوادرات تھیں جو معلوم نہیں کہاں کہاں سے فراہم ہو کر آتی تھیں۔ مطبوعہ فارسی و عربی کتابوں کا مطالعہ کرتے میں نے مولانا کو نہیں دیکھا۔ بعض قلمی کتابوں کے متعلق میں نے مولانا سے دریافت کیا تو آپ نے صرف اتنا جواب دیا کہ "اب یہ جواہرات کہاں نصیب ہوتے ہیں"

مولانا اگرچہ انگریزی تحریر و تقریر سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں مگر مولانا کو انگریزی ادب کے تمام قدیم و جدید لٹریچر پر پورا عبور حاصل ہے اور شاید کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ مولانا فرانسیسی زبان پر بھی اس حد تک شعور رکھتے ہیں کہ نہ صرف جدید فرنچ ادبیات بلکہ کلاسیکل ادب پر بھی مولانا کی ماہرانہ نگاہ ہے جیل کے ساتھیوں میں کئی ایسے انگریزی اور فرانسیسی کے فاضل اشخاص بھی تھے جن سے مولانا ادبیات عالیہ پر اکثر طویل تنقیدی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ان حضرات نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ کس طرح مولانا نے فرانسیسی اور انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل کر لیا ہے وہ فرنچ شعراء پر گھنٹوں اس طرح گفتگو کرتے جس طرح کسی انگریزی یا عربی فارسی کے شاعر پر۔

میرے لئے نینی جیل کی زندگی علمی، ادبی اور سیاسی خزانوں کی انمول لڑی تھی اور اس لڑی میں مولانا آزاد موتیوں کے درمیان ہیرا تھے۔ میں نے نینی جیل سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد کانگریس کو چھوڑ دیا اور مسلم لیگ میں بڑے جوش و خروش سے شرکت کی۔ مولانا آزاد کے مسلک کو غلط سمجھا اور قیام پاکستان کو صحیح مانا مگر اس کے باوجود کہ ایک شدید اختلاف رائے موجود ہے اور پاکستان و ہندوستان دو جداگانہ ملک بن گئے، مولانا آزاد کہاں اور ہم کہاں۔ لیکن نینی سنٹرل جیل کا ایک سال اب بھی مجھے اپنی زندگی کے ہر سال سے زیادہ پیارا ہے۔ کتنی عظیم الشان محفل تھی وہ! اور کتنا خوش قسمت تھا میں کہ مولانا آزاد کی علمی صحبتوں سے اس بے تکلفی اور آزادی کیساتھ ایک سال تک لطف اندوز ہوتا رہا۔

چھٹی گرفتاری

9ر اگست 1942ء

برطانوی حکومت

ہندوستان کی افرادی قوت اور وسائل اہلِ ہند کی مرضی کے خلاف جنگ کی بھٹی میں جھونک رہی تھی لیکن ہندوستانیوں کی غلامی کی زنجیریں کھولنے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ کانگریس نے برطانوی استعمار پر آخری زبردست وار کرنے کا فیصلہ کیا اور حکومت کے خلاف کھلی بے تشدد بغاوت شروع کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ 14ر جولائی کی ورکنگ کمیٹی میں طویل ریزولیوشن میں اس کی وضاحت کی گئی۔ مولانا آزاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سارا وقت ملک کے مختلف حصوں کے کانگریسی رہنماؤں سے ملاقاتوں اور سفر میں صرف ہوا۔ یہ سارا عرصہ ''ناخوشی'' کی کلفتوں میں گزرا۔ (فارسی میں ناخوشی بیماری کو کہتے ہیں) اس کا انکشاف انہوں نے گرفتاری سے قبل کے مکتوب 3ر اگست 1942ء میں کیا ہے جو انہوں نے بمبئی جیل میں سفر کے دوران تحریر کیا اور گرفتاری کی وجہ سے مکتوب الیہ کو بھیجا نہ جاسکا۔ لکھتے ہیں:۔

> ''دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے، سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں اس وبالِ دوش سے کیونکر سبک دوش ہوں! دیکھئے ''وبالِ دوش'' کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی''

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں!

"29 ر جولائی کو اس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گزرے کہ کل 2 ر اگست کو بمبئی کے لئے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا' اب پھر اپنے ساتھ واپس لے جارہاہوں"

رو میں ہے رخشِ ' کہاں دیکھئے' تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں

"میں ایک کوپے میں سفر کررہاہوں۔ اس کی چار کھڑکیاں ہیں' دو بند تھیں' دو کھلی تھیں۔ میں نے صبح اٹھتے ہی وہ دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جیسی گرم ہوتی جاتی ہے۔ اتنی ہی ہوا کے جھونکوں میں خنکی بڑھتی جاتی ہے۔ جس بسترِ کرب پر ناخوشی کی کلفتوں نے گرا دیا تھا' اسی پر نسیم صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہو گی۔ جب خواجہ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:

خوشش بادا نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشینان را دوا کرد!

"ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جارہی ہے۔ جس منزل سے اس وقت تک گزر جانا چاہئے تھا' ابھی تک اس کا سراغ دکھائی نہیں دیتا' سوچتاہوں تو اس معاملۂ خاص میں وقت کے معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہورہی ہے:"

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگزشت و دگرے درپیش ست

"رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتاہوں' نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی' تو سکون تھا' کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوئی ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا' تو دوسرا تخریب کی برہم زنی:"

بیداری میانِ دو خواب ست زندگی گردِ تخیلِ دو سراب ست زندگی!
از لطمۂ دو موج حبابے رومیدہ است یعنی طلسمِ نقش بر آب ست زندگی

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس 5 ر اگست کو مولانا کے زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس 7 ر اگست کے سامنے پیش کرنے کے لئے ریزولیوشن تیار کیا گیا۔ پچھلی میٹنگ سے اس وقت تک صورتِ حال میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی مولانا نے اس پر روشنی ڈالی۔ اس کے اسباب کی تفصیل سے وضاحت کی جن کے باعث ورکنگ کمیٹی کو اپنا رویہ بدلنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے تحریک

شروع کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ مولانا نے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"اس وقت ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے' ہماری قوم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں سکتی' ہندوستان نے جمہوری ممالک کے ساتھ تعاون کرنا چاہا تھا' مگر برطانوی حکومت نے باعزت تعاون کی راہیں بند کر دیں۔ اب صورت یہ ہے کہ جاپانی حملہ آور دروازہ تک آ گیا ہے' اس لئے قوم اپنے اندر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے' برطانیہ اگر مناسب سمجھے تو ہندوستان کو خالی کر سکتا ہے' جیسے اس نے سنگاپور' ملایا اور برما کو خالی کر دیا ہے' ہندوستانی ملک چھوڑ کر نہیں جا سکتے' کیونکہ یہ ان کا وطن ہے' اس وجہ سے وہ اپنے میں اتنی طاقت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی زنجیروں کو توڑ سکیں اور نئے حملہ آور کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔"

"ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلہ میں عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے اور برطانوی حکومت کے متوقع گمراہ کن پروپیگنڈہ کو بے نقاب کرنے کی غرض سے مولانا ابوالکلام آزاد نے تجویز پیش کی کہ تحریک کے مقاصد سے عالمی طاقتوں کے رہنماؤں کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ امریکہ کے صدر روز ویلٹ' چین کے قوم پرست رہنما چیانگ کائی شیک اور برطانیہ میں مقیم روس کے سفیر کو خطوط لکھے جائیں اور انہیں بتایا جائے کہ تحریک کا اصل مقصد انتقالِ اقتدار ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس کیلئے غیر معمولی انتظامات

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس کانگریس کی تاریخ اور تاریخ حریت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے صوبہ بمبئی کانگریس کمیٹی نے بڑے وسیع انتظامات کئے تھے۔ صوبائی کانگریس کے صدر مسٹر یوسف مہر علی نے اس میں بڑی دلچسپی لی تھی' بمبئی شہر کے قلب میں گوالیہ ٹینک پر 30'000 مربع فٹ جگہ پر دوہرے شامیانے لگائے گئے تھے تاکہ بارش سے بچا جا سکے کیونکہ اگست کے مہینے میں بمبئی میں زبردست مون سون ہوتی ہے۔ 300 ملکی اور غیر ملکی اخبار نویسوں کے بیٹھنے کیلئے جگہ کا انتظام کیا گیا جو اجلاس کی کارروائی کی خبریں حاصل کرنے کیلئے بمبئی میں جمع ہوئے تھے۔ 7'500 مندوبین کو ٹھہرانے کا بندوبست تھا۔ حکومت کانگریس کے متوقع اقدامات سے اس قدر خائف تھی کہ اس نے اجلاس کی اہمیت کو کم کرنے اور عوام کی نفسیات سے کھیلنے کیلئے یہ شوشہ چھوڑا کہ مسٹر ایم این رائے اور مسٹر جناح کی سربراہی میں "قومی حکومت" قائم کی جا رہی ہے۔ مسٹر ایم این رائے نے ڈیرہ دون سے جو تحریری بیان جاری کیا اس میں کہا گیا تھا۔ "زمانۂ جنگ کی وسیع البنیاد حکومت کانگریس کو ہمیشہ کے لئے تنہا بنا دے گی اور کانگریس کی دیوالیہ قیادت کی اکڑفوں اور گیدڑ بھبکیوں کا خاتمہ کر دے گی" (ہندوستان ٹائمز یکم اگست 1942ء)

7 / اگست 42ء جمعہ کی نماز کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا تاریخی اجلاس ڈھائی بجے شروع ہوا۔ اجلاس میں 200 ممبروں نے شرکت کی جبکہ دس ہزار وزیٹرز تھے۔ جو پانچ صد روپے کا ٹکٹ خرید کر اجلاس میں شریک ہوئے۔ تین ہزار والنٹیر پنڈال کے اندر انتظامات اور دیکھ بھال کے لئے موجود تھے۔ بارش کے باوجود پانچ ہزار سے زائد کا مجمع پنڈال سے باہر تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صدارت کی۔ "بندے ماترم" گا کر اجلاس کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے سابقہ اجلاس کی کارروائی توثیق کے لئے پیش ہوئی اس کے بعد مولانا نے 100 منٹ اجلاس سے خطاب کیا۔ جس کا لبِ لباب تھا:۔

"محاذ آرائی ہندوستان پر مسلط کی گئی ہے حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لے۔ ہمیں ہندوستان کی آزادی کا اعلان فوری درکار ہے' ہم اپنی طرف سے فوراً اقوام متحدہ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہوں گے۔ ہمارا واحد مقصد جنگ لڑنا اور فتح حاصل کرنا ہو گا"

آزادیٔ ہندوستان کے بارے میں نہایت اہم تاریخی قرارداد رائے شماری کے لئے پیش ہوئی مولانا کہتے ہیں:۔

"سوائے چند کمیونسٹوں کے' جنہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی' آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام ممبروں نے ورکنگ کمیٹی کے تیار کئے ہوئے ریزولیوشن کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے بھی خطاب کیا اور دو روز کی بحث و گفتگو کے بعد 8 / اگست 1942ء کو رات گئے ریزولیوشن بھاری اکثریت رائے سے منظور ہو گیا"

مولانا رات گیارہ بجے کارروائی سے فارغ ہو کر بھولا بھائی کی رہائش گاہ پر پہنچے' جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ اس سے آگے کا حال انہوں نے گرفتاری کے صرف ایک یوم بعد 10 / اگست کو قلعہ احمد نگر کے بالاو کہنہ حصار کی اوٹ سے اپنے "صدیقِ مکرّم" کو ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے جسے من و عن درج کیا جاتا ہے۔ 11 / اگست کے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ 1916ء میں پیش آیا' جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر 1921' 1931ء' 1932ء' اور 1940ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی' اور اب اسی منزل سے قافلہ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے:

باز می خواہم ز سر گیرم رہِ بیہودہ را!

قلعہ احمد نگر

10 / اگست 1942ء

از ساز و برگِ قافلۂ بےخوداں مپرس
بےنالہ می رود جرس کاروانِ ما!!

صدیقِ مکرّم!

کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مائیگی کا یہ حال تھا کہ 3ر اگست کا لکھا ہوا مکتوب سفر میں بھی اجمل خان صاحب کے حوالے نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعہ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اُس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھئے کہ جی چاہتا ہے' دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں:

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند!

نو مہینے ہوئے 4ر دسمبر 1941ء کو نینی کا مرکزی قید خانہ میرے لئے کھولا گیا۔ کل 9ر اگست 1942ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں' اور کتنے ہی بند کئے جاتے ہیں تاکہ کھلیں' نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی:

دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی!

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے' جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گزر چکی:

چوں صفحہ تمام شد' ورق برگردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے' معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کریگا:

فریب جہاں قصّۂ روشن ست
بہ بیں تاچہ زاید، شب آبستن ست

4ر اگست کو بمبئی پہنچا تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیفیت ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ 4 سے 7ر اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ 7 کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا' لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ 8 کو دو بجے سے رات گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا' لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا:

کام تھے عشق میں بہت' پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحبِ مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصے سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچاتا تھا تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفا منظور نہیں کیا ہے' لیکن انہیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لئے کہا بھی

نہیں وہ کہنے لگے۔ فلاں شخص شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ ''گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا'' دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا:

یا وفا، یا خبر وصلِ تُو، یا مرگِ رقیب
بازی چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ جس طرح کے حالات درپیش ہیں۔ ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا؟ اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجئے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے' اور چند گھنٹے آرام کر لوں:

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم!

حسبِ معمول چار بجے اٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین Gen Asprin کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسوّدہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روزویلیٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہو گا، کچھ نسیمِ صبح گاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی:

نسیمِ صبح! تیری مہربانی

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطہ میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا، میں خواب دیکھ رہا ہوں، اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا:

زہے مراتب خوابے کہ بہ زبیداری ست!

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہونگے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گویا اتنی ہی خبر میرے لئے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی؟

میں نے دھیرو سے کہا، مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا، کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے، اور باہر نکلا تو پانچ بج کر سینتالیس منٹ ہوئے تھے[1]۔

کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم!

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیمِ صبح کے جھونکے احاطہ کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے، اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی۔

صبا وقتِ سحر بوئے ززلفِ یار می آورد
دلِ شوریدۂ ما را زنو در کار می آورد!

کار وکٹوریہ ٹرمینس سٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا، اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا، لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہل چل دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ ایک انجن ریسٹورنٹ کار کو دھکیل دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا، یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لئے طیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیرج (   ) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا، گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت

۱۔ ○ ..... مولانا نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خان کو جو اس وقت مولانا کے پاس آ چکے تھے ضروری ہدایات دیں۔ اس کے بعد مولانا برآمدے میں آئے۔ بھولا بھائی اور ان کی بہو ڈپٹی کمشنر سے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا نے مسکرا کر بھولا بھائی سے کہا کہ ان کے دوست پچھلی شام کو جو خبر لائے تھے صحیح نکلی۔ پھر مولانا نے ڈپٹی کمشنر سے مخاطب ہو کر کہا "میں تیار ہوں" اس وقت پانچ بجے تھے۔
مولانا ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھ گئے ایک دوسری کار میں ان کا سامان رکھا اور وہ پیچھے پیچھے چلی۔
(ہماری آزادی ص۱۷۶)

۲۔ ○ ..... حکومت نے صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو ہی نہیں بلکہ کمیٹی کے مقامی کانگریسی لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور پورے ملک میں یہی کیا جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی انتظار میں کھڑی تھی..... اس وقت ایک انجن گاڑی میں ڈائننگ کار لگا رہا تھا.....
مولانا اس کے پاس لائے اور ڈبے میں بیٹھا دیئے گئے جہاں وہ کھڑکی کے پاس کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
اس کے بعد فوراً ہی جواہر لال، آصف علی اور ڈاکٹر محمود نظر آئے۔ جواہر لال نے مجھے بتلایا کہ گاندھی جی کو بھی اسٹیشن لائے ہیں اور وہ دوسرے ڈبے میں بٹھائے گئے ہیں۔ ایک یوروپین فوجی افسر نے چائے کا پوچھا۔
تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا فوجی افسر آیا اور اس نے زندانیوں کو گننا شروع کیا۔ وہ کسی وجہ سے چکرایا ہوا سا تھا۔ کیونکہ اس نے متعدد بار گنا۔ جب وہ مولانا کے ڈبے میں آیا تو اس نے ذرا بلند آواز میں کہا "تیس"۔ جب اس نے دو تین مرتبہ یہی کیا تو مولانا نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا "بتیس"۔ اس سے وہ اور پریشان ہو گیا اور اس نے پھر گننا شروع کیا۔ (ہماری آزادی ص۱۷۶۔۱۷۷)
ورکنگ کمیٹی کے نو اور ممبر مولانا کے ساتھ قلعہ احمد نگر لائے گئے تھے۔ ان متذکرہ بالا تین ممبروں کے علاوہ شنکر راؤ دیو، گوند ابھ پنت، ڈاکٹر پٹا بھائی سیتا رمیا، اچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پرفلا گھوش، راجن بابو ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے چونکہ بمبئی کے جلسے میں شرکت کے لئے نہیں آئے تھے اس لئے ان کو پٹنہ میں گرفتار کر کے وہیں نظر بند کر دیا گیا۔ (ہماری آزادی ص۱۸۲)

کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آ چکے ہیں جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں!

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بہ مشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہو گا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا ہے؟ اسے بھی کوئی جگانے کے لئے پہنچا یا نہیں؟

درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست

زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست!

بہر حال وقت کی گرم جوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چونکہ ریسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چائے کے لئے پوچھا گیا تھا، اسلئے کوپی چکا تھا، لیکن پھر بھی منگوائی، اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبح گاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں:

بنوش مے چو سبک روحی اے حریف! مدام

علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری!

یہاں "بادہ دوشینہ" کی ترکیب محض "جام صبح گاہی" کی مناسبت سے زبان قلم پر طاری ہو گئی۔ مگر غور کیجئے، کتنی مطابق حال واقع ہوئی ہے؟ صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورت حال کیسی منقلب ہو گئی؟ کل شام کو جو بزم کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا۔ لیکن اب صبح کے وقت دیکھئے تو:

نے وہ سرور و سُوز، نہ جوش و خروش ہے!

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلسِ دوشیں کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی، تو اب صبحِ خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

خمیازہ سنجِ تہمتِ عیشِ رمیدہ ایم

مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار برد!

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا، تو کاش جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی، اور نپے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیئے ہوتے۔ خواجہ میر درّد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا

بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا!

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہو گا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا:

کس نہ دانست کہ منزل گہ مقصود کجاست

ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید!

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں' ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی' اور پونا کی راہ اختیار کی

ا۔ ○ ...... مولانا نے مسز آصف علی کو پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ جب گاڑی چلنے لگی تو انہوں نے مولانا کی طرف دیکھا اور کہا "میری فکر نہ کیجئے گا میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی کام نکال لوں گی بے کار نہ بیٹھوں گی" مولانا کہتے ہیں "بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھلایا"۔

مسز نائیڈو مولانا کے ڈبے میں آئیں اور کہا کہ گاندھی جی ملنا چاہتے ہیں۔ مولانا کوری ڈور کے راستے گاندھی جی کے ڈبہ میں گئے جو ذرا فاصلے پر تھا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ گاندھی جی بہت ہی افسردہ نظر آ رہے تھے مولانا نے کبھی ان کو اس قدر اداس اور زنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ مولانا سمجھ گئے کہ ان کو اس اچانک گرفتاری کا اندیشہ نہیں تھا۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ حکومت کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی۔

مولانا کو گاندھی جی سے اس بارے میں اتفاق نہیں تھا اور انہوں نے بار بار آگاہ کیا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں مگر گاندھی جی کو اپنی رائے پر زیادہ اعتماد تھا۔ اب چونکہ ان کے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے وہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔

گاندھی جی نے مولانا سے کہا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی حکومت کو اطلاع کریں کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس اپنے فرائض جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہیں پرائیویٹ سیکرٹری اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں کیونکہ جب مولانا پچھلی مرتبہ گرفتار ہوئے تھے تو نینی جیل میں حکومت نے یہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ ان سہولتوں کا مطالبہ کیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کو ایک مسئلہ بنا لینا چاہئے۔ مولانا اس مطالبے کو حق بجانب نہ سمجھتے تھے اور وہ کسی ایسے مسئلے پر حکومت سے لڑنا نہیں چاہتے تھے جسے کانگریس نے نہ اٹھایا ہو۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ پولیس کمشنر جو ساتھ ہی سفر کر رہا تھا اندر آیا اور مولانا کو اپنے ڈبے میں جانے کے لئے کہا اور مزید کہا کہ صرف مسز نائیڈو گاندھی جی کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ مولانا اور پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ڈبے میں آ گئے۔ (ہماری آزادی ص ۱۷۷۔۱۷۹)

۲۔ ...... گرفتاریوں کی خبر کسی طرح پونا پہنچ چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف پولیس تھی اور عوام کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی البتہ پل کے اوپر بڑا اژدھام تھا جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی لوگوں نے "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں نے نعرے لگائے تو کمشنر نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دے دیا۔ اسے کسی قسم کے مظاہرے اور نعرہ زنی کی اجازت نہ دینے کا حکم ملا تھا۔

جواہر لال کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔ پولیس کو لاٹھی چارج کرتے دیکھ کر ڈبے سے باہر کود پڑے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھے کہ "تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" پولیس کمشنر پیچھے لپکا اور پنڈت جی کو ڈبے میں واپس لانے کی کوشش کی۔ پنڈت جی غصے سے باتیں کرنے لگے۔ اس اثنا میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر اتر پڑے۔ چار سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا اور گاڑی کو واپس جانے کو کہا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو پولیس ان کو زبردستی اٹھا کر ڈبے میں لائی۔ مولانا نے پنڈت جواہر لال کو پکار کر کہا کہ اندر آ جائیں۔ جواہر لال غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے مولانا کا کہنا مان لیا۔ پولیس کمشنر مولانا کے پاس آیا اور دو تین مرتبہ معذرت کی۔ "جناب والا! مجھے سخت افسوس ہے مگر مجھے ان باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور میں ان کو بجا لانے پر مجبور ہوں"

مولانا نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز نائیڈو اور گاندھی جی گاڑی سے اتار لئے گئے اور انہیں آغا خاں کے محل میں نظر بند کیا گیا۔

توسب کو خیال ہوا غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے۔ لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد سٹیشن پر صرف بعض رفقاء اتار لئے گئے اور بمبئی کے مقامی قافلہ کو بھی اترنے کے لئے کہا گیا' مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا' صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستّر اسّی میل سے زیادہ نہیں' اس لئے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہئے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے۔ بہت جلد آ جائے گا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمد نگر سے تو شروع ہو گا۔ بے اختیار ابو العلاء معرّی کا لامیّہ یاد آ گیا:

فيا دارها بالخيف ان مزارها
قريبٌ ولا كن دون ذٰلك اهوال

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے۔ مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو قصد بھی کیا تھا مگر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علمِ استقلال بلند کیا' اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ' جس کا خاندان مازندراں سے آکر یہیں آباد ہوا تھا' لکھتا ہے' چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

کس پائمال آفت فرسودگی مباد
دیروز ریگِ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا' اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا' اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ 1803ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا' تو اگرچہ تین سو برس کے انقلاب سہہ چکا تھا' پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے: ؎

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشان ہاکہ بہ ہر راہگزار افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاندنی بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے:

بیفشاں جرعہ برخاک و حالِ اہلِ شوکت ہیں!
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد!

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگزشت محمد الباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آ گئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خان لودھی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے درپیش و فتح آسمانی۔ اگر حادثہ رود ہد، جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم خانخاناں نے جواب دیا تھا "زیرِ لاشہا"!

و نحن اناسٌ لا توسّط بیننا
لنا الصدردون العالمین اوالقبرُ!

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیئے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، اور ایسا ہی ماجراء میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لئے ورق پر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔

گاہے گاہے بازخواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لئے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لئے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست!

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ سٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

ہاں رہِ عشق ست کج گشتن نہ دارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست استغفار نیست!

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہو گی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے، اور اس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا

میں داخل ہوگئے۔ غور کیجئے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے' خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا!

قلعہ کی خندق' جس کی نسبت ابو الفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی' اور جسے 1803ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے' وہ طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا۔ کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی' وہ بھی اس رخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی۔ پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ فٹ بلند ہو گا اور اس لئے چڑھائی پر واقع ہے۔ کاریں رک گئیں اور ہمیں اترنے کے لئے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا' ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالہ کی۔ وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا[1] یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سرشتہ حکومت بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آ گیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہو گئے:

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نہ می رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہو گا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے بر آمدہ ہے' اور بیچ میں کھلی جگہ ہے' یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے' تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لئے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آ گیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے:

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے۔ جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے!

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا:

۱۔ ○..... ایک ایک نام پکارتا گیا اور قلعہ میں داخل کرتا گیا (ہماری آزادی ص ۱۸۱)

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں!

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے؟ چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہر حال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہو گی ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہاں اسے بھی گرا دیا ہوتا،

سبحان اللہ اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں۔ اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لئے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامے سے آباد ہو!

کشتوں کو تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہو گا خراب بھی تو خرابات ہوویگا!

مغربی رخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا[1]۔ میں نے قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

ما گوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو نو بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی:

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے!

تین بجے اٹھا تو تازہ دم اور چست و چالاک تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی۔ نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا[2]۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا، اور چائے دم دے دی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصوّر کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہکن سنا رہا ہوں!

شریں تر از حکایتِ مانیست قصۂ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم!!

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نہیں نصیب ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے:

۱۔ ○ ..... "اس کے بغل کے کمرے میں جواہر لال تھے اور تیسرے میں آصف علی اور ڈاکٹر سیّد محمود اس طرف کا آخری کمرہ ڈائننگ روم تھا" (ہماری آزادی ص ۱۸۱) "یہ فوجی بیرک معلوم ہوتی تھی اس کا کوئی دو سو فٹ لمبا صحن تھا جس کے چاروں طرف کمرے تھے پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں غیر ملکی قیدی یہاں رکھے جاتے تھے" (ہماری آزادی ایضاً ص ۱۸۲)

۲۔ ں ..... مولانا کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے تھے تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی انہیں انفلوئنزا تھا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے کے ایام میں بخار بھی رہا۔ حکومت کو بخوبی علم تھا۔ انسپکٹر جنرل ڈاکٹر تھا۔ وہ مولانا کا معائنہ کرنا چاہتا تھا لیکن مولانا اس پر راضی نہیں ہوئے (ہماری آزادی ۱۸۳۔ ۱۸۴)

غلط گفتی "چرا سجادۂ تقویٰ گرد کردی؟"
بہ زُہد آلودہ بودم، گرنمی کردم، چہ می کردم!

قلعہ احمد نگر میں شب وروز

قلعہ میں مشغولیات و مصروفیات کا احوال مولانا نے "انڈیا ونز فریڈم" میں بھی لکھا ہے۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی کچھ نہ کچھ کرنے کا پروگرام بنالیا تھا تاکہ صحت اور ہمت قائم رہے۔

اس پروگرام کے مطابق وہ صبح آٹھ بجے ناشتے کی میز پر اکٹھے ہوتے، پھر گیارہ بجے دوپہر کے کھانے کے لئے، اس کے بعد سب لوگ مولانا کے کمرے میں جمع ہوتے اور ایک دو گھنٹے مختلف موضوعات پر بحث ہوتی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد چار بجے چائے کے وقت پھر ملتے۔ چائے کے بعد صحن میں کچھ ورزش کرتے۔ رات کا کھانا آٹھ بجے کھایا جاتا ہے اور عام طور پر بحث و گفتگو کا سلسلہ دس بجے رات تک جاری رہتا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔

مولانا صبح چار بجے اٹھنے کے عادی تھے لیکن 15 / اگست 1942ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن خان کا شعریاد آگیا:

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

زندانیوں کے اس قافلے میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملے میں میرا شریکِ حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں، اور اس وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم کسے بقافلہ بودہ ست پاسباں
بیدار شو کہ چشمِ رفیقاں بخواب شد

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھُر گھُر کی آواز آنے لگتی ہے مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لئے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے، آئی تھی اور واپس گئی لہٰذا گر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں۔ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسبِ معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

مؤتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری محمد شاہی امراء میں سے تھا۔ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہو گا۔ ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آ جاتا ہے

زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود
نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبعیّت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا۔ 'داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کر لیا' ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جا سکتا تھا' وہ بھی کر لیا' لیکن اس سے زیادہ انہیں ہمارے معاملات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی رشتہء کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے

ہمیں یہاں رکھنے کے لئے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا' وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی 8/ اگست کو یرودا سنٹرل جیل پونا سے ایک سینئر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لئے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورت حال پیش آنے والی ہے۔ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈی ٹینشن کیمپ Detention Camp کھل رہا ہے۔ چند دنوں کے لئے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا' اور بیچارہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اس غریب پر نکالا تھا' اس لئے کئی دن تک منہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا' وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا

دَرِ ہرکس کہ زدم' بے خبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے؟ معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے۔ اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو اسے کام میں لایئے

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابرست

بہر حال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا' اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا۔ کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی' کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی' کوئی اخبار نہیں آ سکتا۔ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اس پر غور کرنے کے لئے طیار ہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کونسی بات رہ گئی تھی۔ جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت از راہِ عنایت اسے دُور کر دیتی؟

یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دعا کے لئے — زباں جلائی' کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے

انسپکٹر جنرل نے کہا اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں' گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی۔ اس لئے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لئے ساتھ رکھ لی تھیں' مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہوا اگر مکان سے بعض مسوّدات اور کچھ کتابیں آ جائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیا را بہ اُمید خوردہ اند' آرزو عیب نہ دارد!

نقابِ چہرۂ امید باشد گردِ نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا' تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہو گئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی' جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا' تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی۔ ایسی حالت میں عزّتِ نفس کا تقاضہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے نہ کوئی توقع رکھی جائے

زتیغِ بے نیازی تا توانی' قطعِ ہستی کُن
فلک تا افگند از پا ترا' خود پیش دستی کُن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے۔ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے' میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار؟ گریباں تو مرا دُور نہیں!

19/ اگست 1942ء کے مکتوب میں سپرنٹنڈنٹ کا نام چیتا خان رکھنے کا پس منظر' باورچی کی چیتا خان سے تکرار اور اس پر جبر و اختیار کے فلسفے کا انطباق بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔ یہاں

صرف زندانوں پر ہی سختی نہ تھی بلکہ ہر شخص چیخ رہا تھا۔ ملازمین کی تلاشی لیکر اندر آنے اور باہر جانے دیا جاتا تھا۔ جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہ تھی مبادا اسی راہ سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے اب مفصل حال پڑھیے۔۔

چو تخمِ اشک بہ کلفت سرشتہ اند مرا　　بہ نا اُمیدی جاوید کشتہ اند مرا
ز آہِ بے اثرم داغِ خام کاریٔ خویش　　ز آتشے کہ نہ دارم، برشتہ اند مرا

وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے، آپ کو مخاطب تصوّر کروں اور کچھ لکھوں۔ مگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ مرزا غالب نے رنجِ گراں نشیں کی حکایتیں لکھی تھیں۔ صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں:

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے　　کبھی شکایت صبر گریز پا کہیے!

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں۔ نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے جو ناصر علی نے اس کے تمام کلام میں سے چنا تھا:

من ازیں رنجِ گرانبار چہ لذت یا بم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند!

اگر اس شعر کو اپنی حالت پر ڈھالنے کی کوشش کروں تو یہ ایک طرح کی خودستائی اور خویشتن بینی کی بے صرفگی سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ کہنے میں کیا عیب ہے کہ اس مقام کی لذت شناسی سے بے بہرہ نہیں ہوں اور اس کا آرزومند رہتا ہوں؟ اسی عرفی نے یہ بھی تو کہا ہے۔

منکر نہ تواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بہ من گر نہ بود، بادگرے ہست

یہاں پہنچنے کے بعد چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا، اسی دن ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا، آئی، ایم، ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک (Sandak) نام ہے، اور یہاں کے لئے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا۔ یہ سینڈک، بینڈک کون کہے؟ کوئی اور نام ہونا چاہئے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظہ نے یاد دلایا کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتہ خان نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت کا نام چیتہ خاں ہی رکھ دیا کہ اوّل بہ آخر نسبتے دارد:

نام اُس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں!

ابھی دو چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتہ خان تھا۔ قیدی اور وارڈر بھی

اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتہ خان وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا چیتہ خان کون؟ کہنے لگا میجر اور کون؟

ماہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

بہرحال غریب جیلر کی جان چھٹی۔ اب سابقہ چیتہ خان سے رہتا ہے۔ جب جاپانیوں نے انڈیمین پر قبضہ کیا تھا تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان غارت گیا۔ اپنی بربادیوں کی کہانیاں یہاں لوگوں کو سناتا رہتا ہے:

اگر مادردِ دل داریم، زاہد دردِ دیں دارد!

اس مرتبہ سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا کیا گیا ہے کہ زندانیوں کا کوئی تعلق باہر کی دنیا سے نہ رہے۔ حتیٰ کہ باہر کی پرچھائیں بھی یہاں نہ پڑنے پائے۔ غالباً ہمارا محل قیام بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اب گویا احمد نگر ہی جنگ کے پُراسرار مقامات کی طرح سمِ ویران انڈیا Some where in India کے حکم میں داخل ہو گیا۔ دیکھئے ناسخ کا ایک فرسودہ شعر یہاں کیا کام دے گیا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہو گا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

قلعہ کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں، یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے۔ گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لئے اسے کام میں لایا گیا ہے۔ جنگِ بوئر کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے ان کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا۔ گزشتہ جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن یہیں نظر بند کئے گئے اور موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ جو مصر سے لایا گیا تھا، یہیں نظر بند رہا۔

چیتہ خان کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کی ٹریننگ کی ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اس نے دکھایا کہ ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے۔ میں نے جی میں کہا۔ غالباً اسی لئے ہمیں یہاں لا کر رکھا گیا ہے کہ ابھی درس گاہِ جنون و وحشت کے کچھ سبق باقی رہ گئے تھے:

دریں تعلیم شد عمرو ہنوز ابجد ہمی خوانم
نہ دانم کے سبق آموز خواہم شد بہ دیوانش

احاطہ کے مغربی رخ پر جو کمرے ہیں اور جو ہمیں رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں ان کی کھڑکیاں قلعہ کے احاطہ میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں۔ اس خیال سے کہ ہماری طرح ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جا سکیں، تمام کھڑکیاں دیواریں چن کر بند کر دی گئی ہیں۔ دیواریں ہمارے آنے سے ایک دن پہلے چنی گئی ہوں گی کیونکہ جب ہم آئے تھے تو سفیدی خشک نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ پڑ جاتا تو اپنا نقش بٹھا دیتا، اور نقش اس طرح بیٹھتا کہ پھر اٹھتا نہیں:

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

دیواریں اس طرح چنی ہیں کہ اوپر تلے، داہنے بائیں، کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا۔ روشندان تک چھپ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی ہوتیں، تو کون سا بڑا میدان سامنے کھل جاتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعہ کی سنگی دیواروں تک نگاہیں جاتیں اور ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی۔ روشندان کے آئینے تک بند کر دیئے گئے:

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

قلعہ کے دروازے کی شب و روز پاسبانی کی جاتی ہے اور قلعہ کے اندر بھی مسلح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہماری حفاظت کے لئے مزید روک تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے احاطہ کا شمالی رخ پہلے کھلا تھا۔ اب دس دس فٹ اُونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنایا گیا ہے، اور اس دروازے پر بھی رات دن مسلح فوجی پہرہ رہتا ہے۔ فوج یہاں تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے۔ وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں۔ جیلر اور ایک وارڈر کے سوا جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لئے نکلنا پڑتا ہے، اور کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کوئی دروازے سے گزرے سنتری کو جامہ تلاشی دے۔ وارڈر کو ہر مرتبہ برہنہ ہو کر تلاشی دینی پڑتی ہے۔ وہ جیلر کے پاس جا جا کر روتا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ پہلے دن جیلر نکلا تھا تو اس سے بھی جامہ تلاشی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ "ایں ہم بچہ شتر ست!"

بازار سے سودا سلف لانے کا انتظام یوں کیا گیا کہ قلعہ کے دروازے کے پاس فوجی ادارہ کا ایک دفتر ہے۔ یہاں کے سپرنٹنڈنٹ کا آفس ٹیلیفون کے ذریعہ اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جب بازار سے کوئی چیز آتی ہے تو پہلے وہاں روکی جاتی ہے اور اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر وہاں کا متعینہ افسر سپرنٹنڈنٹ کو فون کرتا ہے کہ فلاں چیز اس طرح کی اور اس شکل میں آئی ہے مثلاً ٹوکری میں ہے اور رومال میں بندھی ہے، یا ٹین کا ڈبہ ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر یہاں سے جیلر احاطہ کے دروازے پر جاتا ہے اور نشان زدہ سامان سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں اٹھوا لے جاتا ہے۔ اب پھر دوبارہ دیکھ بھال کی جاتی ہے اگر ٹوکری ہے تو اسے خالی کر کے اس کا ہر حصہ اچھی طرح دیکھ لیا جائے گا کہ ادھر ادھر کوئی پرچہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ شکر اور آٹے کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے کیونکہ ان کی تہہ میں بہت کچھ چھپا کر رکھ دیا جا سکتا ہے!

وارڈر جو پونا سے یہاں لائے گئے ہیں، وہ آئے تو تھے قیدیوں کی نگرانی کرنے مگر اب خود قیدی بن گئے ہیں۔ نہ تو احاطہ سے باہر قدم نکال سکتے ہیں نہ گھر سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ جیلر کو بھی گھر خط لکھنے کی اجازت نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے، انہی راہوں سے کوئی خبر باہر پہنچ جائے۔ وہ روتا رہتا ہے کہ مجھے صرف ایک دن کی چھٹی ہی مل جائے کہ پونا ہو آؤں، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہاں جسے دیکھوں، ہائے ہائے کر رہا ہے

شبنم خرابِ مہر' کتاں سینہ چاکِ ماہ'
لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں!

اس صورتِ حال نے یہاں کی ضروریات کی فراہمی میں عجیب عجیب الجھاؤ ڈال دیئے ہیں۔ چیتہ خان جب دیکھو کسی نہ کسی گرہ کے کھولنے میں الجھا ہوا ہے مگر گرہیں ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا اور پیش آیا۔ باہر کا کوئی آدمی رکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ قیدی بن کر رہنے کیوں لگا؟ اور قیدیوں میں ضروری نہیں کہ باورچی نکل آئے۔ قیدی باورچی جبھی مل سکتا ہے کہ پہلے کوئی قرینہ کا باورچی ذوقِ جرائم پیشگی میں اتنی ترقی کرے کہ پکڑا جائے' اور پکڑا بھی جائے کسی اچھے خاصے جرم میں کہ اچھی مدت کی سزا دی جا سکے۔ لیکن ایسا حُسنِ اتفاق گاہ گاہ ہی پیش آ سکتا ہے' اور آج کل تو سوءِ اتفاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے باورچیوں میں کوئی مردِ میدان رہا ہی نہیں۔ انسپکٹر جنرل آیا تھا تو کہتا تھا' یروداجیل میں ہر گروہ اور پیشے کے قیدی موجود ہیں مگر باورچیوں کا کال ہے۔ نہیں معلوم ان کم بختوں کو کیا ہو گیا ہے:

کس نہ دارد ذوقِ مستی' مے گساراں را چہ شد

جو قیدی یہاں چن کر کام کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں' ان میں سے دو قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے:

ستم رسیدہ یکے' نا اُمیدوار یکے!

حالانکہ دونوں اس الزام سے بالکل معصوم واقع ہوئے ہیں اور زبانِ حال سے نظیریؔ کا یہ شعر دہرا رہے ہیں۔ داد دیجئے گا' کہاں کی بات کہاں لا کر ڈالی ہے' اور کیا برمحل بیٹھی ہے:

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بنیمش
می آرم اعترافِ گناہِ نہ بودہ را

چیتہ خان یہاں آتے ہی اس عقدۂ لاینحل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روزانہ اپنی طلب و جستجو کی ناکامیوں کی کہانیاں سناتا:

اگر دستے کنم پیدا' نہ می یابم گریباں را

ایک دن خوش خوش آیا' اور یہ خبر سنائی کہ ایک بہت اچھے باورچی کا شہر میں انتظام ہو گیا ہے۔ کلکٹر نے ابھی فون کے ذریعہ خبر دی ہے کہ کل سے کام پر لگ جائیگا:

صبا بہ خوش خبری ہُدہُدِ سلیمان ست
کہ مُژدہ طرب از گلشنِ سبا آورد

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخِ موعود یہی ہے:

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا، لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا، جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا۔ اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا:

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا!

بعد کو اس معاملہ کی جو تفصیلات کھلیں، ان سے معلوم ہوا کہ یہ شکار واقعی کلکٹر ہی کے جال میں پھنسا تھا۔ کچھ تو اس کے زورِ حکومت نے کام دیا، کچھ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ کی ترغیب نے، اور یہ اجل رسیدہ دام میں پھنس گیا۔ اگر اسے بعافیت قلعہ میں فوراً پہنچا دیا جاتا، تو ممکن ہے، کچھ دنوں تک جال میں پھنسا رہتا، لیکن اب ایک اور مشکل پیش آ گئی۔ یہاں کے کمانڈنگ افیسر سے باورچی رکھنے کے بارے میں ابھی بات چیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ پونا کے صدر دفتر کی ہدایت کا انتظار کر رہا تھا، اور اس لئے اس شکار کو فوراً قلعہ کے اندر لے نہیں سکتا تھا۔ اب اگر اسے اپنے گھر جانے کا موقعہ دیا جاتا ہے تو اندیشہ ہے کہ شہر میں چرچا پھیل جائے گا، اور بہت ممکن ہے، کوئی موقعہ طلب اس معاملہ سے بروقت فائدہ اٹھا کر باورچی کو نامہ و پیام کا ذریعہ بنا لے۔ اگر روک لیا جاتا ہے، تو پھر رکھا کہاں جائے کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ جگہ ہو، اور باہر کا کوئی آدمی وہاں تک پہنچ نہ سکے؟

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا!

اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بےوقوفی کہ اسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانہ میں بھیج دیا، کیونکہ ان کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانہ کی کوٹھری ہی تھی۔ قید خانہ میں جو اسے ایک رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے؟ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی طیار ہو گیا:

کہ عشق آساں نمود اوّل، ولے اُفتاد مشکل ہا!

بہرحال دو دن تو اس نے کسی نہ کسی طرح نکال دیئے۔ تیسرے دن ہوش و حواس کی طرح صبر و قرار نے بھی جواب دے دیا۔ میں صبح کے وقت کمرے کے اندر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں، جیسے باہر ایک عجیب طرح کا مخلوط شور و غل ہو رہا ہو "مخلوط" اس لئے کہنا پڑا کہ صرف آوازوں ہی کا غل نہیں تھا، رونے کی چیخیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی آدمی دم گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہتا جاتا ہے اور پھر بیچ بیچ میں روتا بھی جاتا ہے۔ گویا وہ صورتِ حال ہے جو خسرو نے سخت کشانِ عشق کی سنائی تھی کہ:

قدرے گرید! و ہم بر سر افسانہ رود!

باہر نکلا تو سامنے کے برآمدے میں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ چیتہ خان دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، سامنے باورچی زمین پر لوٹ رہا ہے، تمام وارڈرز حلقہ باندھے کھڑے ہیں، قیدیوں کی قطار صحن میں

صف بستہ ہو رہی ہے، اور ہمارے قافلہ کے تمام زندانی بھی ایک ایک کر کے کمروں سے نکل رہے ہیں۔ گویا اس خرابہ کی ساری آبادی وہیں سمٹ آئی ہے:

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں!

چھیتہ خان کہہ رہا ہے، تمہیں کوئی اختیار نہیں کہ یہاں سے نکلو۔ باورچی چیختا ہے، کہ مجھے پورا اختیار ہے تمہیں کوئی اختیار نہیں کہ مجھے روکو۔ جبر و اختیار .... (Determinism and free will) کا یہ مناظرہ سن کر مجھے بے اختیار نعمت خان عالی کا وہ قطعہ یاد آ گیا جو اس نے مختار خان کی ہجو میں کہا تھا اور جس کی شرح لکھنے میں صاحبِ خزانہ عامرہ نے بڑی مغز پاشی کی ہے:

ایں دلیل از جبرمی آورد اُو از اختیار
ایں سخن ہم درمیاں ماندہ ست امرِ بَیِّن بَیِّن

باورچی ان لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ:۔

قومے بہ جدّوجہد گرفتند وصلِ دوست

مگر چھیتہ خان اس پر زور دیتا تھا کہ:۔

قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند ![1]

جیلر نے خیال کیا کہ حقیقت حال کچھ ہی ہو، مگر "بین الجبر و الاختیار" کا مذہب اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس کی نظر اشاعرہ کے "کسب" اور شوپن ہار (   ) کے "ارادہ" پر گئی:

گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ ما حافظ
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من ست

اس نے باورچی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح کی ہٹ ٹھیک نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک مہینا نکال دو۔ پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت مل جائے گی:

مُرغِ زیرک چوں بہ دام افتد تحمّل بایدش

لیکن اس کا معاملہ اب نصیحت پذیریوں کی حد سے گزر چکا تھا:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

ایک مہینے کی بات جو اس نے سنی، تو اور کپڑے پھاڑنے لگا:

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

۱۔ ○ ..... یعنی "ڈیٹر من ازم" اور "فری ول" کے درمیان راہ نکالنے کا مذہب جیسا کہ مسلمان متکلموں میں اشاعرہ نے اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں اگرچہ انسان خدا کی قدرت کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا مگر اسے "کسب" کی قوت حاصل ہے یعنی ارادہ کے ساتھ کام کرنے اور اس کے اثرات کسب کرنے کی قوت حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا ارادہ بھی خود اس کے بس کی چیز نہیں۔ دراصل اشاعرہ کا کسب بھی مذہب جبر کی ہی ایک دوسری تعبیر ہے۔ شوپن ہار نے اسی اعتقاد کو یوں تعبیر کیا کہ ہمارے تمام افعال کی تہہ میں ہمارا ارادہ کام کرتا ہے اگرچہ ہمارا ارادہ ہمارے اختیار میں نہیں۔

شام کو چھیتہ خان اس طرف آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اس طرح مجبور کر کے کسی آدمی کو رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ اگر اسے جبراً رکھا گیا تو ہم اس کا پکا ہوا کھانا چھونے والے نہیں۔ چنانچہ دوسرے دن اسے رہائی مل گئی۔ اتوار کے دن حسبِ معمول کلکٹر آیا تو معلوم ہوا جس دن چھوٹا تھا' اسی دن اس نے اپنا بوریا بستر سنبھالا اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تک نہیں:

کردہ ام توبہ' و از توبہ پشیماں شدہ ام
کافرم' باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

یہ تو باورچی کی سرگزشت ہوئی' لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگزشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا کہ دھوبی کے سوال نے سر اٹھایا۔ چھیتہ خان کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا تھا۔ مگر رشتۂ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ وہی غالب والا حال ہوا کہ:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ امید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

25ر اگست کو مولانا نے وائسرائے کو ایک خط لکھا کہ انہیں اس کی شکایت نہیں ہے کہ حکومت نے انہیں اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرنا مناسب سمجھا البتہ جو سلوک روا رکھا جا رہا تھا اس کی شکایت کی' کہ ایسا سلوک سزا یافتہ قیدیوں سے نہیں کیا جاتا' انہیں بھی اپنے قریبی عزیزوں سے خط و کتابت کی اجازت ہوتی ہے' مگر ان کو اس سے بھی محروم رکھا گیا۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ وہ دو ہفتے انتظار کریں گے۔ اگر حکومت کی طرف سے اطمینان بخش جواب موصول نہ ہوا تو اس صورت میں آئندہ کارروائی کرنے کے بارے میں غور کریں گے۔

27ر اگست 1942ء کے مکتوب میں قید خانے سے باہر اور قید خانے سے اندر کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور اسے دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دیا ہے۔ زندگی کو حالات کی ناگواریوں اور خوش گواریوں میں تقسیم کیا ہے۔ اسے کاک تیل سے تشبیہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی۔ ایک اندر کی۔

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل وقعرِ دریا آتش ست!

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں:

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ نخشم مایۂ طلاباف است

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لئے بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں:

تا کے چو موجِ بحر بہر سو شتافتن　　　در عینِ بحر پائے چو گرداب بند کُن!

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انہیں پھر سے آراستہ کر دوں!

وقتبست و گر بُت کدہ سازند حرم را!

اس تحوّلِ صورت کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکیں گی، لیکن خود میرے فریبِ حال کے لئے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں اور جب تک اس کے سراغ میں نہ نکلوں، اسے واپس نہیں لا سکتا!

دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

اگر آپ مجھے اُس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے، جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم، اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں العمل۔ "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست　　　بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست!

پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری نیست!　　　خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جزء رواقیہ (Stoics) کا ہے ایک لذتیۃ Epicurean s کا

پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار اُفتاد ست!

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقتِ بد کہ روئے دہد آب سیل رواں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کُند، موجِ آب گیر!

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیت کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں:

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست!

میں نے اپنے کاک تیل (Coak Tail) کے جام میں دونوں بوتلیں اونڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جام مر تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھئے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاق میں نے تازہ کر دی ہے:

چناں افیون ساقی درمے افگند
حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

البتہ کاک تیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اسے کام لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermuth) اور جن (Gin) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں درخور ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست!

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لئے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیہّ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقعہ ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، انہیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سرو سامان کہاں میسر آ سکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے۔ جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہّ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لئے

اور غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سرو سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر

ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وفی اَنفسِکُم افلا تُبصِرُون؟

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پَر کھول دیگا، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا:

نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جامی روم، از خویش می جوشد تماشائے!

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے، اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تو وہ صرف قید خانہ سے باہر ہی نہیں چمکتیں۔ اسیران قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی، اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا۔ قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے اور کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حُسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا!

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو۔ جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سرو سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے۔ مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا اینجا ست!

ایوان و محل نہ ہوں تو کبھی درخت کے سائے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرُو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں' تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمایاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں۔ صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی۔ چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر دلِ زندہ پہلو نہیں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لئے کس چولہے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے' دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں' اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو' کوئی جگہ ہو' اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا' اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد ست
"عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد ست!

باہر کے سارے سازو سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں' لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا' میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دمیدش خرّم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واں دراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتمش" ایں جامِ جہاں بیں بتوکے داد حکیم؟"
گفت" آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد"

اسی مکتوب میں آگے چل کر مولانا نے زندگی گزارنے کے ڈھنگ پر روشنی ڈالی ہے ان کا کہنا ہے کہ زندگی ہنسی خوشی گزارنی چاہیئے خوش رہنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ بجھا ہوا دل' سوکھا چہرہ اور افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر بنانا معاشرہ کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں' لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی۔ یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہئے جس نے یہ مشکل حل کرلی' اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا'

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہُنر دارد عشق
گفتم "اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں" !

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے: "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے"؟ پھر جواب دیا ہے، جو "سب سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔ اس سے ہم چینی فلسفہ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمتِ سردم کہ ایں قدم وارد!

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے' تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی' کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہئے اور دوسروں سے بھی کہتے رہئے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔

چو مہمان خراباتی بعشرت باش بادنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں' گرایں ستی خمار آرد

زمانہ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندری ژید ( ) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں اس میں دوسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی' اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے' جسے عرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا:

بدیدارِ تو دل شاد ند باہم دوستانِ تو
تراہم شادماں خواہم چو روئے دوستاں بینی!

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب' فلسفہ اور اخلاق' تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود

زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا' اتنا ہی زیادہ مذہبی' فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا۔ گویا علم اور تقدس' دونوں کے لئے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ (Cynics) ہی کا شعار نہ تھا' بلکہ رواقی (Stoics) اور مشائی (Peripateba) نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہب طمانیت و مسرت (Eudemonism) اور مادّیاتی مذہبِ عشرت (Hedonism) کے تصوّرات مستثنیٰ کر دیجئے تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سر کہ روئی سے خالی نہیں ملے گا۔ مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خنک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دیانت داری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قا آنی کو کہنا پڑا تھا:

اسبابِ طرب را ببراز مجلس بیروں
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی:

ہرچہ در جملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن دار منی و گبر و نصارا و یہود!

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی' تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بعض یارانِ بے تکلف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلسِ ما زاہد از نہاد تکلف نیست
البتہ تو می گنجی عمامہ نمی گنجد !

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی' تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی ایک زاہد' ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی چاند کا ہنستا ہوا چہرہ ستاروں کی چشمک' درختوں کا رقص' پرندوں کا نغمہ' آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں' اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک

دہکتاہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو' اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر' ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر' پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کِھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
کشادہ روئے تراز رازہائے مستاں باش
تمیز نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست
چو چشم آئینہ اور خوب وزشت حیراں باش

29 ر اگست 1942ء کے مکتوب میں مولانا نے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے وائسرئے کو جو خط 25 ر اگست کو لکھا تھا یہ خط انسپکٹر جنرل نے حکومت کو بھیج دیا تھا۔ اس کا جواب مل گیا ہے۔ جس کے مطابق پابندیاں نسبتاً نرم کر دی گئیں۔ اب قریبی رشتہ داروں کو خط لکھنے کی اجازت تھی! اخبار ملنے لگا تھا البتہ کسی سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ لکھتے ہیں۔

ایں رسم و راہِ تازہ زحرمانِ عہدِ ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت دراز نفسی کے لئے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں' میرے ذوقِ مخاطبت کے لئے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے۔

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل شنیدنی بود نالۂ ما

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے۔ یہی حال میرا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب، تہی از خودیم و پُراز طلب
چہ دمد زصنعتِ صفرِ نے[1] بجز اینکہ نالہ فزوں کند

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے موجودہ تجربہ ان سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نج کی خط و کتابت روکی نہیں جاتی تھی۔ اخبارات دیئے جاتے تھے' اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے۔ مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں' لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور

---

[1] ..... بانسری میں جو سوراخ بنائے جاتے ہیں انہیں فارسی میں "صفرِنے" کہتے ہیں۔ یعنی بانسری کے نقطے۔

آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دنیا میں بس رہا ہے جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا۔

زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورد تھا!

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کر لے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے، اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے۔

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کُدام؟

زیں ہوسہا بگذریا نہ گزر، می گزرد!

یہ حالت انقطاع و تجرّد کا ایک نقشہ بناتی تھی، مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا۔ کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے، نہ باہر کی صداؤں کو زنداں کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد

ہاں، کچھ اک رنج گرانبارئِ زنجیر بھی تھا

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں، بلکہ صدائیں بھی بیک دفعہ رک گئیں۔ اصحابِ کہف کی نسبت کہا گیا ہے کہ فضربنا علی اذانهم فی الكهف سنين عدداً تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہو گئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے، وہ دنیا ہی نہ رہی:

كان لم يكن بين الحجون الى الصفا

انيس، ولم يسمر بمكة سامر!

اچانک ایک نئی دنیا میں لا کر بند کر دیئے گئے جس کا پورا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا، اور جس کی ساری مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی۔ اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی:

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب!

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت کا سکون متاثر نہیں ہوا تو یہ صریح بناوٹ ہو گی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا، تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو، اور افسردگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو، یا، مخلص خاں عالمگیری نے کیا

خوب لفّ و نشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجئے!

خمارِ ما! ودرِ توبہ' و دلِ ساقی'
بیک تبسّمِ مینا شکست و بست و کُشاد!

اب معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے 'مگر فکر و تصوّر کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جاسکتے ہیں تو کون ایسا زیاں عقل ہو گا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصان نہیں جنوں میں' بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع 'تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لئے موجبِ شکایت نہ ہو سکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا۔ اس کا آرزومند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں' میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔ باطنه فيه الرحمه وظاهره من قبله العذاب

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے 'مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کامجوئیوں میں لگ گئی:

در خرابا تم نہ دیدستی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر رہتا تھا۔ اگر چھن گیا تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا' سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما!

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی 'اس لئے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ صرف دو کتابیں میرے ساتھ گئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لئے رکھ لی تھیں۔ اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا' تو لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی' کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

در جنوں بیکار نہ تواں زیستن
آتشم تیزست و داماں می زنم

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لئے بر آمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں' یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکار ئ جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا' وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لئے یہ ہیں کہ اخبار دیئے جائیں گے' قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ملاقات چیتہ کسی سے نہیں کی جاسکتی۔ چیتہ خان نے یہاں کے فوجی میس (Mess) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوالیا تھا' وہ اس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو ہمارے لئے معدوم ہو چکی تھی' پھر سامنے آکھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کئے:

ہے ایک خلق کا خون اشکِ خونفشاں پہ میرے
سکھائی طرز اِسے دامن اٹھا کے آنے کی!

میں نے چیتہ خان سے کہا کہ اگر 9ر اگست تک کے پچھلے پرچے کہیں مل سکیں تو منگوادے۔ اس نے ڈھونڈھوایا تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک انہیں دیکھتا رہا تھا:

دیوانگاں ہزار گریباں دریدہ اند
دستِ طلب بہ دامنِ صحرا نہ می رسد

مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہئے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لئے نہیں ہوا کرتی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی دوستی بڑی گہری تھی۔ مولانا پنڈت نہرو سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کے دوست پنڈت موتی لال نہرو کے فرزند تھے۔ مولانا اور پنڈت جواہر لال نہرو کے قریبی تعلقات کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے "انڈیا ونز فریڈم" کو اپنے دوست اور ساتھی جواہر لال کے نام منسوب کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اگرچہ اردو زبان سے خوب آشنا تھے اور بڑی شستہ اردو بولتے تھے لیکن اردو شاعری سے انہیں خاص شغف نہ تھا۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کی اسارت کے زمانے میں انہوں نے اردو شعراء کے کلام میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کرتے تھے۔ مولانا انہیں روز ایک یا دو شعر لکھ کر دیتے تھے جنہیں وہ یاد کرتے تھے اور اپنی یادداشتوں کی ڈائری میں نقل کر لیتے تھے۔ ان شعروں کو اپنے خطوط میں استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے 14ر مئی 43ء کو جو خط اپنی لختِ جگر اندرا گاندھی کو لکھا اس میں مرزا اسد اللہ خان غالب کا شعر رقم کیا۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!!

پنڈت جواہر لال گرفتار ہوئے تو انہوں نے Plato کی Republic کے علاوہ Proust کی Remembrance of things Past اور Lin yutage کی With love and irony تین کتابیں ساتھ رکھ لی تھیں۔ انہوں نے تاریخ، سیاست اور فلسفہ کی ستّر کے قریب اور کتابیں منگوائیں ان میں سے بیشتر وسط ستمبر تک پہنچ گئیں۔ مسٹر ایم۔ جے۔ اکبر Nehru The making of India کے صفحہ 354 پر لکھتے ہیں کہ مولانا پہلے ہی سے افلاطون، ارسطو، عرب عہد، عہدِ اوسط اور ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کا گہرا مطالعہ کر کے مہارت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے ہندوستان کے بارے میں مختلف منتخب کتابیں منگوائیں۔

مولانا نے بعض پابندیاں ختم کرنے کے بارے میں 25 راگست کو جو خط وائسرائے کو لکھا تھا اس کا زود اثر ہوا اور اب اخبارات ملنے لگے تھے۔ جن "میں ٹائمز آف انڈیا" اور "بمبئی کرانیکل" شامل تھے (ایم جے اکبر صفحہ 351)

مولانا کی گوری چنبیلی چینی چائے ختم ہو گئی۔ احمد نگر اور پونا سے پتہ کرایا لیکن ان بازاروں میں کوئی اس جنسِ گراں مایہ سے آشنا نہ نکلا۔ مجبوراً مولانا کو ہندوستان کی اس سیاہ پتی کا جوشاندہ پینا پڑا۔ جسے مولانا کے بقول لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں، اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں ۔ دراصل مولانا کا چائے نوشی کا مذاق بہت اعلیٰ تھا۔ اس باب میں ان کا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں تھا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا۔ یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر ہی کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

لکھتے ہیں۔ اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتش سیّال کی تعبیر سے کام لیا ہے:

مئے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھئے، جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں، ملّا محمد مازندانی صاحب بت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خانخاناں کی

خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا۔

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گزر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوق لطیف کا شہرستان کیف و سرود' اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں؟

جواہرلال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں' خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے' شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لیچو وپیچوہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بے سود تھا' بلکہ ''وضع الشیِٔ فی غیر محلّہ'' کے حکم میں داخل تھا:

مے بہ زہّاد مکن عرضہ کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

ان حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنہوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا' کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے۔ مگر اچھی ہے یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو روز پیا کرتے ہیں' مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ ان کی صرف ''اچھی ہے'' کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انہیں بلا لیا کرتا تھا کہ آیئے' ایک پیالی اس ''اچھی ہے'' کی بھی پی لیجئے!

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست

ان کے لئے یہ صرف ''اچھی'' ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ ''اچھی ہے'' ختم ہو جائے۔ غالبؔ کیا خوب کہہ گیا ہے:۔

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں
ہیں' نہ می دانی کہ یک پیمانہ نقصان کردہ ایم!

مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہونے پر آیا۔ چیتہ خان نے یہاں دریافت کرایا۔ پونا بھی لکھا۔ لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے۔ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے' ایک ہفتہ سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں

نہ کنی چارہ لبِ خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل!

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوران کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے' اس لئے یہاں بھی ایک چینی رسٹوران کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہوگی۔ اس نے خالی ڈبہ بھیج کر دریافت کرایا۔ انہوں نے ڈبا دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے؟ لیکن تمہیں ڈبا کہاں سے ملا؟ اور اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آ رہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا اس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چنگ کائی شک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آ رہی ہے' اور اس کے لئے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

بہ بیں کہ نقش املہا چہ باطل افتادست

چائے کے ڈبے کی تہہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اسے ڈبے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں یہ آخری ڈبا ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اس کی تہہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں۔ لیکن چیتہ خان نے دیکھا تو کہا' آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے۔ یہ چورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے' میں نے بھی سونچا کہ:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست' دم دَرکش
کہ ہر چہ ساقیٔ ماریخت عینِ الطاف ست

چنانچہ یہ چورا بھی کام میں لایا گیا' اور اس کا ایک ایک ذرہ دم دے کر پیتا رہا جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا' تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

ہر چند کہ نیست رنگ و بو یم　　　　آخر نہ گیاہِ باغ اویم!

اس تخیّل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں' توسنِ فکر کی جولانیوں کے لئے تازیانے کا کام دیا' اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا' یا' مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغم دریں شبستاں خمارِ شرمِ عدم نہ گیرد
ز چشمک ذرّہ جام گیرم بہ آں شکوہے کہ جم نہ گیرد!
دریں قلمرو کفِ غبارم' بہ ہیچ کس ہمسری نہ دارم
کمالِ میزانِ اعتبارم بس ست کز ذرّہ کم نہ گیرد!

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خُم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں' تو کاش' اس تہِ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں' غالب نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے' ورنہ
یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہہِ جام بہت ہے!

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اٹھایا تھا' مگر مجھے فوراً اس کا حل مل گیا' اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی صاف شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہو گئی تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائے گی۔ نہیں ملی تو ڈلیوں کے بکس تو ضرور مل جائیں گے۔ لیکن جب بازار میں دریافت کرایا تو معلوم ہوا' امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں کی مانگ نہ تھی' اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں ان کا سراغ کہاں مل سکتا ہے؟ مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اسے کٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں۔ لیکن کوٹنے کے لئے ہاون کی ضرورت ہوئی۔ جیلر سے کہا۔ ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں؟

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر　　بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را!

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں' اور بہت' ردی کاغذ اوپر تلے دھر دیا' پھر ایک پتھر اٹھا کر ایک قیدی کے حوالہ کیا' جو یہاں کام کاج کے لئے لایا گیا ہے' کہ اپنے سر کی جگہ اسے پیٹ:

دریں کہ کوہکن　　از ذوق داد جاں' چہ سخن؟
ہمیں کہ تیشہ بہ سر دیر زد، سخن باقی ست!

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا!

کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی۔ البتہ کاغذ کے پرزے پرزے اڑ گئے' اور کپڑے نے بھی اس کے روئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا:

چلی تھی برچھی کسی پر' کسی کے آن لگی!

بہرحال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا۔ "زشت" اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا انگھڑ ظرف نظر سے نہیں گزرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسطِ ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں یہ ہاون بھی اسی قبیلہ کی دست کاریوں کا بقیہ ہو' اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انہیں سر پھوڑنے کیلئے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

خیر کچھ ہو' مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی' لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے!

اگر دستے کنم پیدا' نہ می یابم گریباں را!

7 جنوری 1943ء کے مکتوب میں احمد نگر کے موسم کا حال لکھنے بیٹھے تو گیارہ صفحے لکھ ڈالے اور فرماتے ہیں کہ ابھی تک حرفِ مدّعا زبانِ قلم پر نہیں آیا لکھتے ہیں:

اگست کے مہینے میں جب ہم یہاں لائے گئے' تو بارش کا موسم عروج پر تھا۔ اور ہوا خوشگوار تھی۔ بالکل ایسی ہی فضا رہتی تھی' جیسی آپ نے جولائی اور اگست میں پونا کی دیکھی ہو گی۔ پانی یہاں عام طور پر بیس پچیّس انچ سے زیادہ نہیں برستا لیکن پانی کی دو چار بوندیں بھی کافی خوشگواری پیدا کر دیتی ہیں۔ اُمس بہت کم ہوتی ہے۔ ہوا برابر چلتی رہتی ہے۔

ستمبر اور اکتوبر اسی عالم میں گزرا لیکن جب نومبر شروع ہوا' تو طبیعت اس خیال سے افسردہ رہنے لگی کہ یہاں سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر جو پچھلا جاڑہ یہاں بسر کر چکا ہے' کہتا ہے کہ پونا سے کچھ زیادہ سردی تھی' لیکن وہ بھی بہ مشکل دس بارہ دن تک رہی ہو گی۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا کہ دہلی اور پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ ان خبروں نے طبیعت کو بالکل مایوس کر دیا تھا۔ لیکن جونہی دسمبر شروع ہوا' موسم نے اچانک کروٹ بدلی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا۔ اور پھر جو مطلع کھلا' تو کچھ نہ پوچھئے موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا؟ دہلی اور لاہور کے چلّہ کا مزہ یاد آ گیا۔ یہاں کے کمروں میں بھلا آتش دان کہاں؟ لیکن اگر ہوتا' تو موسم ایسا ضرور ہو گیا تھا کہ میں لکڑیاں چننی شروع کر دیتا۔ چیتہ خان جو ہر وقت خاکی تخفیفہ (یعنی شارٹ) پہنے رہتا تھا' یکایک گرم سوٹ پہن کر آنے لگا اور کہنے لگا کہ سردی سے میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے۔ چھاؤنی سے خبر آئی کہ ایک انگریز سپاہی جو رات کے پہرہ پر تھا' صبح نمونیا میں مبتلا پایا گیا اور شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ ہمارے قافلہ کے زندانیوں کا یہ حال ہوا کہ دوپہر کے وقت بھی چادر جسم سے چمٹی رہنے لگی جسے دیکھو' سردی کی بے جاستانیوں کا شاکی ہے' اور دھوپ میں بیٹھ کر مالش کرا رہا ہے کہ تمام جسم پھٹ کر چھلنی ہو گیا۔ حتیٰ کہ جو صاحب دہلی اور یوپی کے رہنے والے ہیں اور نینی تال کے موسم کے عادی رہ چکے ہیں' وہ بھی یہاں کے جاڑے کے قائل ہو گئے۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاران فراموش کردند عشق

ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے میں نے ایسا جاڑا اس علاقہ میں نہیں دیکھا۔ پارا چالیس درجہ سے بھی نیچے اتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کون سی نئی بات ہو گئی کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا۔ ان بے خبروں کو کیا

معلوم کہ ہم زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں۔ رب) اشعث مدفوع بالابواب ، لو اقسم علی اللّٰہ لا برّہ!

فدائے شیوۂ رحمت، کہ در لباسِ بہار
بعذر خواہیِ زندانِ بادہ نوش آمد!

یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں' اور میرے دل آرزومند سے اب بھی صدائے ہل من مزید اُٹھ رہی ہے۔ کلکتہ سے گرم کپڑے آئے پڑے ہیں۔ میں نے ابھی تک انہیں چھوا بھی نہیں' اس ڈر سے کہ اگر گرم کپڑے پہنوں گا تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا اور تخیل کو جولانیوں کا موقعہ نہیں ملے گا' ابھی تک گرمیوں ہی کے لباس میں وقت نکال رہا ہوں۔ البتہ صبح اٹھتا ہوں تو اونی چادر دہری کر کے کاندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔ میرا اور سردی کے موسم کا معاملہ تو وہ ہو گیا' جو نظیریؔ نیشاپوری کو پیش آیا تھا:

اُو در وداع و من بجزع' کز مئے و بہار
یک طلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش!

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال ہوا' تمہید ہی میں گیارہ صفحے سیاہ ہو گئے' اور ابھی تک حرف مدّعا زبان قلم پر نہیں آیا۔ تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی و انتظار کے بعد پرسوں چینۃ خان نے مژدہ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈھ نکالی ہے' اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کر دیا ہے۔ چنانچہ کل پارسل پہنچا۔ چینۃ خان نے اس کی قیمت کا گلہ کرنا شروع کر دیا۔ کہ تمہیں ایک پونڈ چائے کے لئے اتنی قیمت دینی پڑی' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کی ارزانی نے حیران کر دیا ہے۔ اس نایابی کے زمانے میں اگر اسٹور اس سے دوگنی رقم کا بھی طلب گار ہوتا' جب بھی یہ جنسِ گرانمایہ ارزاں تھی:

اے کہ می گوئی "چرا جامے بہ جانے می خری؟"
ایں سخن باساقیٔ ماگو کہ ارزاں کردہ است

حسن اتفاق دیکھئے کہ ادھر یہ پارسل پہنچا ادھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیئے۔ اب گرفتاری کا زمانہ جتنا بھی طول کھینچے چائے کی کمی کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

اہلیہ کا انتقال

مولانا پیری مریدی کا موروثی مذہب ترک نہ کرتے تو آرام و آسائش سے زندگی بسر کر سکتے تھے۔ مگر وہ "اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاشِ زیاں کے لئے آئے تھے"۔ چنانچہ خوشحالی کا دور شاذ ہی نصیب ہوا۔ ان کی اہلیہ بھی فقر و فاقہ میں شریک رہیں۔ مولانا کے مصائب و آلام کا غم مستزاد تھا۔

ان کی آخری گرفتاری سے بہت زیادہ فکر مند تھیں۔ اچھا کھانا میسر نہ تھا' شوہر کی مسلسل جدائی کا غم' تنہائی اور عسرت نے صحت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ دو برس سے تپ دق کا موذی مرض حملہ آور تھا۔ مولانا کو سیاسی مصروفیتوں کے ہنگاموں سے فرصت نہ تھی۔ انہیں اتنی مہلت نہ تھی کہ بیوی کی صحت کا خیال رکھتے۔ گرفتاری کے بعد مختلف قسم کی تشویش ناک افواہوں نے زلیخا بیگم کے غم میں اضافہ کر دیا۔ ادھر "دوا اور غذا کی مقدرت نہ تھی"۔ اپنے ڈاکٹروں سے ایک ہی بات کہتیں کہ خدا کے لئے ایک مرتبہ مولانا دکھادو۔" بالآخر 9 راپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔"

ملیح آبادی نے ان کے آخری لمحات کا چشم دید حال قلم بند کیا ہے لکھتے ہیں۔

"مولانا احمد نگر کے قلعہ میں سنتِ یوسفی پوری کر رہے تھے اور کلکتہ میں ان کی بیگم ایڑیاں رگڑ رہی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا' مگر میں عیادت کو نہیں جاتا تھا' کیونکہ مولانا موجود نہ تھے۔ 9 راپریل 43ء کی صبح نو دس بجے فون آیا کہ بیگم صاحبہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ میں فوراً پہنچ گیا۔ گھر کے اداس نظارے ہی نے سب کچھ بتادیا۔ مجھے کہا گیا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو۔ مجھے تامّل ہوا۔ مدتوں ایک ہی گھر میں رہا تھا اور پردہ بھی کانا تھا' مگر کبھی اُچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہ دیکھی تھی۔ میرا پس وپیش دیکھ کر کہا گیا۔ بیگم صاحبہ مصر ہیں کہ تم پہنچو۔ وقتِ آخر ہے دیر نہ کرو۔ مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا۔ مگر نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہنے لگیں: "آپ میرے بھائی ہیں۔ میں آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ ان سے کہنا کہ آپ کے نام پر مر رہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا۔" ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا کہنے لگیں...... "مولانا کے لئے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔" ہچکی آئی اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی۔"

مولانا قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے ان کی رفیقہ حیات داغِ مفارقت دے گئیں۔ اہلیہ کی جدائی کا انہیں شدید صدمہ تھا۔ ان کی طبیعت کا سکون ہل گیا تھا لیکن انہوں نے معمولات زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ "یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا" مولانا نے وائسرائے کو خط لکھا۔ جس کا تذکرہ انہوں نے "انڈیا ونز فریڈم" میں کیا ہے کہ حکومتِ ہند بڑی آسانی سے مجھے عارضی طور پر کلکتہ منتقل کر سکتی تھی تاکہ میں اپنی بیوی کو وفات سے قبل دیکھ لوں۔ اس خط کا جواب نہیں ملا۔ مولانا نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر ایک مکتوب کی شکل میں نثری مرثیہ لکھا ہے۔ "صدیق مکرم" کے نام 11 راپریل 1943ء کا یہ مکتوب بڑا ہی غم آلود' درد انگیز اور دل گداز ہے۔ مولانا کی دلی کیفیات اور سوزِ دروں کا غماز ہے۔ جسے پڑھ کر جگر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

خط کا متن ملاحظہ فرمائیں:۔

قلعہ احمد نگر

11/اپریل 43ء

آنچہ دل از فکرِ آں می سوخت، بیمِ ہجر بود
آخر از بے مہریِ گردوں بہ آں ہم ساختیم!

صدیقِ مکرّم!

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں۔ بلکہ رات کا پچھلا پہر شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا۔ لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا۔ روشنی کی، اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم، دل کجا دماغ کجا؟

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 41ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویشِ خاطر کا موجب ہو گا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں مَیں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے درپیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائیگا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام پر بھیج دیا

جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہیں۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے ہیں۔ اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ 3ر اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو 13ر اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم!

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنیوالی تھی[2]۔

۱۔ ○ ..... گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھی۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل دی گئی اور **بالآخر** طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

۲۔ ○ ..... مولانا جب بمبئی کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو ان کی اہلیہ کی صحت پھر تشویش ناک ہو گئی تھی مولانا لکھتے ہیں:۔

"۹ر اگست کو میری گرفتاری کی خبر سے یقیناً ان کو بہت صدمہ پہنچا ہو گا اور ان کی صحت نے جو پہلے سے نازک تھی ایک اور پلٹا کھایا۔ قید کے زمانے میں ان کی گرتی ہوئی صحت کی خبروں نے مجھے بہت ہی پریشان رکھا۔ ۱۹۴۳ء کے شروع میں گھر سے اطلاع ملی کہ وہ پھر بہت بیمار ہیں۔ اس کے بعد اور بھی وحشت ناک خبر ملی۔ ان کے ڈاکٹر مایوس ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی حکومت کو لکھا کہ مجھے بیوی سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ اس لئے کہ ان کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔ ڈاکٹروں کے اس خط کو حکومت نے بالکل نظر انداز کیا۔ میں نے بھی وائسرائے کو لکھا مگر ہماری خط و کتابت بے نتیجہ رہی"۔

(ہماری آزادی ص ۹۰۔ ۱۸۹)

وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہو گا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ 16ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آ سکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو 17ر ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ 15ر فروری کو مجھے ایک خط 2ر فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورتِ حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

23۔ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اسکی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے۔ اس لئے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جا سکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آ سکتا ہے۔ کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئیگا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہئے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری

قسم میں داخل ہے۔ اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو 23 مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خطِ رمز میں لکھا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دیدی ہے۔ اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دیگا۔ اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط وانقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود، زوم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کیلئے جدّوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدّوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبرو سکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہوسکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے۔ جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں۔ ان میں فرق آنے نہ پائے چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار

کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی۔ اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا' اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا' وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی' دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا' اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے' کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر 9 / اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فان ما تحذرین ' قد وقع !

2 بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا' اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں' لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل

ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم زراہ، ولے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پورانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا، اور مہتمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لَقَد لَامَنی عِندالقبورِ عَلے البکُا
رَفیقی لَنذران الدمُوع السوافک
فقالاً اتبکی کُل قبرٍ رَّأیتَہ
لقبرٍ ثویٰ بین اللوی فالد کاد کِ
فقلت لَہ " ان الشجا یُبعث الشَجا
فَدَمنی فَہذا کُلّہ' قَبر ما لِکْ

اب قلم روکتا ہوں اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے۔

سوؔدا خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ میں

جناب ملیح آبادی مولانا کے رفیقِ قلم ہی نہ تھے بلکہ انہیں فردِ خانہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا کی عدم موجودگی میں تجہیز و تکفین کے انتظامات انہوں نے ہی کئے انہوں نے ذکرِ آزاد میں بیگم آزاد کے سفرِ آخرت کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے لکھتے ہیں۔

"پُر آشوب زمانہ تھا۔ نیشنلسٹ مسلمان گردن زدنی قرار پا چکے تھے۔ مولانا پر تیروں کی سب سے زیادہ بوچھاڑ تھی، لیکن ہوا کیا؟ کلکتہ کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور جامع مسجد میں نماز کے بعد جب جنازہ اٹھا تو ان گنت انسان کندھا دے رہے

○ ..... عربی اشعار کا خلاصہ یہ ہے

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگے تو اس نے مجھے ملامت کی۔ اس نے کہا کیا بات ہے کہ اس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیتا ہے لہٰذا مجھے رونے دے۔ میرے لئے تو یہی تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں"۔

تھے۔ مسلمان ہی نہیں جس ہندو اور سکھ بھائی نے سُنا ساتھ ہو گیا۔ عظیم الشان جلوس قبر تک پہنچا۔ کیوں نہیں اٹھتا؟ عاشق کا جنازہ تھا دُھوم سے اٹھنا ہی تھا۔"

مولانا کی اہلیہ کے انتقال پر پورا ملک ماتم کناں تھا۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک تعزیتی جلسہ 18 اپریل 1943ء کو منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب عبدالرحمٰن صدیقی نے کی۔ جناب حسین شہید سہروردی، مولانا عبدالجبار دہلوی، مولانا راغب احسن اور جناب ابوالہاشم کے علاوہ مسلم لیگ کے دیگر زعمانے خطاب کیا اور حکومت کی سنگدلی، شقاوتِ قلبی اور غیر مہذب اقدام کی مذمت کی۔

مولانا کو اہلیہ کی وفات کا شدید صدمہ تھا۔ انکے انتقال سے مولانا کی طبیعت افسردہ رہنے لگی تھی۔ اِس کا اعتراف انہوں نے 3 ستمبر 1945ء کے مکتوب میں کیا ہے۔ وفات کے بعد کے دیگر مکتوبات سے اس کے شواہد ملتے ہیں۔ 3 ستمبر کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"10 اگست 1942ء سے مئی 1943ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ 9 اپریل 1943ء کے حادثہ کے بعد طبع درماندۂ حال بھی رک گئی تھی، اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفّات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیّر کے جاری رہیں تاہم یہ حقیقت حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ملنے سے بچالیا تھا۔ مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا:"

دلِ دیوانۂ دارم کہ در صحرا ست پنداری

"اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی، جس نے اوائلِ حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل 1945ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف بعض مصنّفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا اور کسی تحریر و تسوید کیلئے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا ہے، 3 مارچ 1945ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے:"

شمّۂ از داستانِ عشقِ شور انگیزِ ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند!

14۔ جون کے مکتوب میں غمِ دل کا حال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے 'ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو' ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لدرہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھئے تو گویا اس کے لئے کوئی انقلابِ حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی پڑی ہے 'اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے":

ہمچو ماہی غیر داغم پوششِ دیگر نہ بود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ برتن داشتم !

"یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی 'مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں 'گرمی و سردی 'خشکی و طراوت 'سب اس کے لئے یکساں ہوگئے:"

"کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا' میں رُک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حُسنِ تعلیل یاد آ گئی۔ "

قطعِ امید کردہ نہ خواہد نعیمِ دہر
شاخِ بُریدہ را نظرے بر بہار نیست

"میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی اُمید و طلب کے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی۔ ان کے لئے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا! "

خزاں کیا' فصلِ گل کہتے ہیں کس کو' کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں'قفس ہے' اور ماتم بال و پر کا ہے

16 ستمبر 1943ء کے مکتوب[1] کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

بچے ربڑ کے رنگین غباروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بچپن میں ان کا بڑا شوق تھا۔ والد مرحوم کے مریدوں میں ایک شخص غلام رحمٰن تھا جو انگریزی ٹوپیوں کے بنانے کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ مجھے یہ

[1] یہ مکتوب پہلے ایڈیشنوں میں شامل نہ تھا۔ مکتبہ احرار آزاد ہند پبلی کیشنز ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور نے جو "غبار خاطر" شائع کی اس میں یہ مکتوب پہلی مرتبہ شائع ہوا جناب نوابزادہ نصر اللہ خان نے اپنے ہاتھ سے صاف لکھ کر کتابت کے لئے دیا تھا۔ اصل خط آغا شورش کاشمیری کے صاحبزادگان کے پاس ہے۔ جسے وہ مولانا کے دیگر خطوط کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

غبارے لا دیا کرتا اور میں اس سے بہت ہل گیا تھا۔ یہ غبارے ویسے ہی ہوتے ہیں، جیسے منہ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں گیس بھر دی جاتی ہے اور وہ انہیں اوپر کی طرف اُڑائے رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا۔ اسے چھید کے دیکھنا چاہئے۔ اندر سے کیا نکلتا ہے؟ شہسرام کی ایک مغلانی امانی نام ہمارے گھر میں سلائی کا کام کیا کرتی تھی۔ میں نے امانی کے سلائی کے بکس سے ایک سوئی نکالی اور غبارے میں چبھو دی اس واقعہ پر سینتالیس برس گزر چکے، لیکن اس وقت بھی خیال کرتا ہوں تو اس سنسنی کا اثر صاف صاف دماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے جو اس وقت اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ گیس باہر نکلنے کیلئے کچھ ایسی بے تاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوارہ کی طرح مضطربانہ اُچھلی، اور دو تین سیکنڈ بھی ابھی نہیں گزرے تھے کہ غبارہ خالی ہو کر سکڑ گیا اور زمین پر گر گیا!

یقین کیجئے، آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ غبارے کی طرح اس میں بھی کوئی پُر جوش عنصر ہے جو بھر گیا ہے اور نکلنے کیلئے بیتاب ہے۔ اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اٹھا کر چبھو دے، تو مجھے یقین ہے، اس میں سے بھی ویسا ہی جوش امنڈ کر اُچھلے گا، جیسا غبارہ سے ایک مضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا:

شد آن کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش!
ببانگِ چنگ بگوئیم آن حکایت ہا
کہ از نہفتنِ آن دیگِ سینہ می زد جوش!

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لئے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا۔ جو آیا اور گزر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہہ نہ سکی!

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا!

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سٹ سفر میں رہا کرتا تھا۔ جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا۔ لیکن جب سامان قلعہ کے اندر لایا گیا۔ تو اس میں سٹ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ باہر روک لیا گیا ہے۔ جیلر سے پوچھا تو اس نے کہا۔ کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے اور اب گورنمنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ بہر حال جب یہاں اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سٹ کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی؟ تین ہفتے کے بعد اخبار کی روک تو اٹھ گئی مگر سیٹ پھر بھی واپس نہیں دیا گیا۔ وہ چیتہ خان کے آفس میں مقفل پڑا رہا۔ اب میں نے

چھینہ خان کو دے دیا کہ اپنے بنگلہ میں لگا کر کام میں لائے' کیونکہ اب وہ جس بنگلہ میں منتقل ہوا ہے' اس میں لاسلکی سیٹ نہیں ہے"

"لیکن آجکل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے۔اس کے پاس لاسکی کا سیٹ ہے۔ کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آنکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی۔بی۔سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین (Vialin) بجانے والا اپنے کمال دیکھا رہا تھا۔ لے ایسی تھی جیسی کہ [illegible]) کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سوانگس وداوٹ ورڈز) کے سننے میں آئی تھی"

حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنی ست
بہ نالۂ دف و نے در خروش و ولولہ بود

"ناگہاں ایک مغنیّہ خوش لہجہ کی صدائے دردانگیز اٹھی اور اس نے ساز کے زیروبم کے ساتھ ملکروہ عالم پیدا کیا۔ جس کی طرف خواجہ شیراز نے اشارہ کیا ہے"

چہ رامی زند ایں مطربِ مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد!

" پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا' جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے' لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا تو بدستور انقباضِ خاطر واپس آگیا تھا"

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخمِ مرا لذّتِ آزار نہ ماند

اہلیہ کی وفات کے غم سے مولانا کا چوالیس پونڈ وزن کم ہو گیا تھا اور صحت جواب دے گئی تھی۔ رہائی کے بعد معالجوں نے وادیٔ کشمیر کی گل گشتیوں میں سراغرسانی کا مشورہ دیا۔ مولانا وہاں تین ہفتے تک مقیم رہے۔

ہرچند جستجو کی لیکن متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا

نکل گئی ہے کوسوں دیارِ حرماں سے

جیل میں ان کی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کی داستان بڑی دراز ہے۔ کیونکہ وہ ہر فن مولا تھے آپ نے دیکھا کہ جس موضوع پر لکھنا شروع کیا صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیئے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ حرفِ مدّعا زبانِ قلم پر نہیں آیا۔ ایک تو گرفتاری سے قبل اور بعد کا واقعہ ہے کہ یہ تو آپ بیتی ہوئی اور بیان

کر دیا۔ لیکن یہ قلعہ احمد نگر اس کی تاریخ، سپرنٹنڈنٹ کا نام تجویز کرنا تو ایسے ہی نہیں بلکہ تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے۔ باورچی کا مسئلہ سامنے آیا تو اصرار و اذکار کی تکرار کو کس خوبصورت انداز میں جبرو اختیار سے تعبیر کیا۔ اپنی جیل خانے کی زندگیوں کے لئے بھی فلسفہ سے اصطلاحات ڈھونڈ نکالیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہی کے لئے وضع ہوئی تھیں۔ چائے کی کمیابی کا مسئلہ پیدا ہوا تو چائے کی تاریخ بیان کر ڈالی، اسے آتشِ سیّال سے تشبیہ دی لیکن طبیعت اس پر مطمئن نہیں ہوئی تو فرمایا۔ "جیسے کسی نے سورج کی کرنیں بلورین فنجان میں حل کر دی ہوں" مصری کوٹنے کے لئے ہاون دستہ ملا تو اس کی زنگ آلود شکل وصورت مولانا کے مزاجِ گرامی پر گراں گزری اسے "زشت" کا نام دیا کہ ہزاروں برس پہلے کا ہے۔

حکایتِ زاغ و بلبل کے عنوان سے جیل میں چڑیوں کی سرگرمیوں، اچھل کود اور پھدکنے کی داستان پورے پچاس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے بلبلوں کی قسمیں تک بیان کر دی ہیں چڑیوں کے بچوں میں سے ایک نے اُڑنا شروع کیا تو اسے خود شناسی اور عرفان کی بیداری سے تعبیر کیا کہ باہر کا کوئی ہنگامۂ سعی اسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی اس کے اندر کا عرفان بیدار ہوا اسے چھپی ہوئی حقیقت معلوم ہوئی تو پھر چشم زدن کے اندر انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے۔ حکایتِ زاغ و بلبل میں دس صفحات پھولوں کی تخم ریزی، آبیاری اور کشت کاری پر بیان کر ڈالے ان کے اقسام، ان کے نام، ان کے رنگ، ان کی شکل، ان کی شباہت اور ان کے انگریزی ناموں کا اردو میں ترجمہ ان کی جلوہ طرازیاں رنگ بو غرض ہر پہلو کا ذکر کر چکے تو فرماتے ہیں کہ خیر یہ چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملہ معترضہ تھا جو بلا قصد اتنا طولانی ہو گیا یعنی اگر قصد کر کے لکھتے تو دفتروں کے دفتر سیاہ کر دیتے کیا خوب انکساری ہے اندازہ کریں، پھولوں کے تذکرہ کا سلسلہ بند کرتے ہوئے آخر میں ایک پیرا میں ان کے تناسل کا تذکرہ کیا ہے کہ اتحادِ تناسلی کے لئے خارج کی مداخلت کا کام کبھی ہوا کے جھونکوں سے لیا جاتا ہے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لیتی ہے۔ جن پھولوں کو خارجی اعانت مل جاتی ہے مادۂ تلقیح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو بار آور ہوتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں، بصورت دیگر بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔

لکھتے ہیں!......

اسی اثنا میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگرچہ ابھی تک =

اُڑتی سی اک خبر تھی زبانی طیور کی!

ہم جب گزشتہ سال اگست میں یہاں آئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں، لیکن مٹی نے بہت کم ساتھ دیا۔ اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اُکتا گئی تھیں اور سبزہ و گل کے لئے ترسنے لگی تھیں۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کہ مشغلہ کا مشغلہ ہوتا ہے اور اصحابِ صورت اور اصحابِ معنی، دونوں کے لئے سامانِ ذوق بہم پہنچاتا ہے۔

بہ بُو اصحابِ معنی را بہ رنگ اصحابِ صورت را

جواہرلال جن کا جوہرِ مستعدی ہمیشہ ایسی تجویزوں کی راہ تکتا رہتا ہے، فوراً کمربستہ ہوگئے اور اس خرابے میں رنگ و بُو کی تعمیر کا سرو سامان شروع ہوگیا۔

دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

اس کارخانۂ رنگ بُو کے ہر گوشے میں وجود کی پیدائش اور جامۂ ہستی کی آرائش کے لئے دو باتوں کی دُرستگی ضروری ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ بیج درست ہو!

گر جاں بد ہد سنگِ سیہ لعل نہ کر دو
باطینتِ اصلی چہ، بد گہر اُفتاد!

دوسری یہ کہ زمین مستعد ہو۔

جوہرِ طینتِ آدم ز خمیرِ دگر ست
تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری!

چنانچہ یہاں بھی سب سے پہلے انہی دو باتوں کی فکر کی گئی۔ بیج کے لئے چھیتہ خان کو کہہ کر پونا لکھوایا گیا کہ وہاں کے بعض باغوں کے ذخیرہ سے بیجوں کی خوبی و صلاحیت کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن زمین کی درستگی کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ احاطہ کی پوری زمین دراصل قلعہ کی پرانی عمارتوں کا ملبہ ہے۔ ذرا کھودیے، اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چُونے اور ریت کا برادہ ہر جگہ نکلنے لگتا ہے۔ درمیانی حصہ تو گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے۔ نہیں معلوم کہ کن کن فرمانرواؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈیوں سے اس خرابے کی مٹی گُوندھی گئی ہے، اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

قدح بہ شرطِ ادب گیر، زاں کہ ترکیبش
ز کاسۂ سرِ جمشید و بہمن ست و قباد!

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین فٹ زمین کھود دی گئی، اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر انہیں بھرا گیا۔ کئی ہفتے اس میں نکل گئے۔ جواہرلال صبح و شام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لئے کوہ کُندن اور کاہ بر آوردن میں لگے رہتے تھے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

اس کے بعد آبپاشی کا مرحلہ پیش آیا، اور اس پر غور کیا گیا کہ کیمسٹری کے حقائق سے فنِ زراعت کے اعمال میں کہاں تک مدد لی جاسکتی ہے۔ اس موضوع پر اربابِ فن نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کیں۔ ہمارے قافلہ میں ایک صاحب بنگال کے ہیں جن کی سائنٹفک معلومات ہر موقعہ پر ضرورت ہو یا نہ ہو اپنی جلوہ طرازیوں کا فیاضانہ اسراف کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے یہ دقیق نکتہ سنایا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی

خون سے سینچا جائے' تو ان میں نباتاتی درجہ سے بلند ہو کر حیوانی درجہ میں قدم رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائے گا اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرنے لگیں گے۔ لیکن آجکل جبکہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آ گئی ہے اور اس کے بینک کھل رہے ہیں بھلا درختوں کے لئے کون اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو گا؟ ایک دوسرے صاحب نے کہا' یہاں قلعہ کے فوجی میس میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ ان کا خون جڑوں میں کیوں نہ ڈالا جائے؟ اس پر مجھے ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا' حالانکہ شعر کہنے کی عادت مدتیں ہوئیں بھلا چکا ہوں۔

کلیوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیجئے تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصہ شعر ہو جائے گا۔

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

شعر سن کر آصف علی صاحب کے شاعرانہ ولولے جاگ اٹھے۔ انہوں نے اس زمین میں غزل کہنی شروع کر دی۔ لیکن پھر شکایت کرنے لگے کہ قافیہ تنگ ہے میں نے کہا' ویسے بھی یہاں قافیہ تنگ ہی ہو رہا ہے۔

دیکھئے' سمندِ فکر کی وحشت خرامی بار بار جادہ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں۔ جو بات کہنی چاہتا تھا' وہ یہ ہے کہ ستمبر اور اکتوبر میں بیج ڈالے گئے۔ دسمبر کے شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی اور جنوری آئی' تو اس عالم میں آئی کہ ہر گوشہ مالن کی جھولی تھا۔ ہر تختہ گل فروش کا ہاتھ تھا۔ گویا..........۔

کنول کہ درچمن آمد گل از عدم بہ وجود
بنفشہ درقدمِ او نہاد سر بہ سجود
بہ باغ تازہ کن آئینِ دینِ زردشتی
کنول کہ لالہ برافروخت آتشِ نمرود
زدستِ شاہدِ سیمیں عذار عیسیٰ دم
شراب نوش ورہا کن حدیثِ عاد و ثمود

کا عالم ہو گیا۔ لیکن آئینِ زردشتی کے تازہ کرنے کا سامان یہاں کہاں تھا؟ اور شاہدِ سیمیں عذرا کے انفاسِ عیسوی کی اعجاز فرمائیاں کہاں میسر آ سکتی تھیں؟ سو اس کی کمی عالمِ تصوّر کی جولانیوں سے پوری کی گئی۔ زمانہ کی تنگ مائیگی جس قدر کوتاہیاں کرتی ہے' فکرِ فراخ حوصلہ کی آسودگیاں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں۔

چوں دستِ مابہ دامنِ وصلش نہ می رسد
پائے طلب شکستہ بداماں نشستہ ایم

وقت کی رعایت سے اکثر پھول موسمی تھے۔ چالیس سے زیادہ قسمیں گنی جا سکتی تھیں سب سے پہلے مارنینگ گلوری نے اس خرابہ بیرنگ کو اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کیا جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر مورنینگ گلوری کی کلیاں کھِل کِھلا کر ہنسنا شروع کر دیتیں۔ ابُو طالب کلیم کو کیا خوب تمثیل سُوجھی تھی۔

شیرئی تبسم ہر غنچۂ رامپرس
ور شیر صبح خندۂ گلُہا شکر گزاشت

کوئی پھول یاقُوت کا کٹورا تھا۔ کوئی نیلم کی پیالی تھی کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی۔ کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بُوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا صناعِ قدرت کے مُوقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہو گا۔ صاف کرنے کے لئے جھٹکنا پڑا' اور اس چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں۔

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں گُل بُوٹا کہاں ہے؟

گلوری کا اردو میں ترجمہ کیجئے تو بات بنتی نہیں۔ اجلالِ صبح وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن ذوق سلیم حرف گیری کرتا ہے۔ اس لئے میں مارنینگ گلوری کو بہارِ صبح کے نام سے پکارتا ہوں۔

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

بہارِ صبح کی بیلیں بر آمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں۔ لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور اپنی کروٹوں سے اسے پامال کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے حصے میں کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے اپنی پھولوں کی سیج بستر سے اٹھا کر چھت پر اُلٹ دی تلووں کے کانٹے چُنتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اُوپر کی طرف رہتی ہے

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

سامنے دو تختوں میں زینیا (Zinnia) کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے' زینیا کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں یہ بڑے زینیا کے پھول تھے۔ ان کے صافوں کی لپیٹ اتنی مرّتب اور مدّور واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی مشتاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی' صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پہرہ

داروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں، اور زندانیانِ قلعہ کی طرح اس باغِ نورُستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے۔

کہ بُلبُلاں ہمہ مستند و باغباں تنہا!

ان تختوں کے درمیان گلِ خطمی یعنی ہالی ہاک Holly Hock کا حلقہ تھا۔ یہ رنگ برنگ کے وائن گلاس¹ ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ ہر شاخ اتنے گلاس سنبھالے ہوئے تھی کہ دل اندیشہ ناک رہتا، کہیں ایسا نہ ہو، ہوا کے جھونکوں کی ٹھوکر لگے اور گلاس گر کر چُور چُور ہو جائیں۔ دانش مشہدی نے غالبًا انہی پھولوں کی ایک شاخ دیکھ کر کہا تھا۔

دیدہ ام شاخِ گُلے، بر خویش می پیچم کہ کاش
می توانستم بہ یک دست این قدر ساغر گرفت

تخیل دراصل امیر خسرو سے ماخوذ ہے جس نے اسی زمین میں کہا تھا۔

ہست صحرا چوں کفِ دست و بر واز لالہ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جامِ صہبا بر گرفت

گُلِ خطمی کے پھولوں کی تشبیہ کتنی ہی دلکش ہو، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ حسنِ نزاکت کی ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں، گلاس خوشنما ہیں مگر نازک نہیں ہیں پٹونیا Petunia نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامنِ رنگین بنا دیا تھا لیکن اس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیل کی پیاس کہاں بُجھ سکتی تھی؟ میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر Aster کارن فلاور Corn flower سویٹ پیس Sweet peas کو کنار Poppy فلکس Phalax کلیوپیس Collipsis اور کاسمس Cosmas کے چھوٹے چھوٹے جُھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بُوقلموں رنگوں کا ایک ٹپکہ بندھ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی چشمِ تماشائی کا سامان دید تھا۔ اہلِ بنیش کے لئے ذوقِ نظر کا سامان نہ تھا حالانکہ۔

بزم میں اہلِ نظر بھی تھے تماشائی بھی

اس غرض کے لئے پنکس Pinks سلویا Salvia اور پنیزی Pansy وغیرہ کے تختوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدہ و دل کو دعوتِ نظارہ دیتی رہتی تھیں۔ قدرت کے قلمِ صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی مُوقلم سے مینا کاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا۔ اسے بھی ضائع نہیں کیا گیا اور قینچی سے تراش تراش کر ننھے

---

¹ قدیم ایرانی ظروف میں "پیانہ" اسی قسم کا ظرف تھا جس طرح کا آج کل "وائن گلاس" ہوتا ہے لیکن اگر پیانہ کہئے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا ناچار وائن گلاس ہی کہنا پڑتا ہے۔

ننھے پھولوں کے ورق بنالئے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں' یہ پھول ہے لیکن اگر خود پھولوں کے لئے کچھ کہنا چاہیں تو انہیں کس چیز سے تشبیہہ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں اور خاموشی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ حسن کی جلوہ طرازیاں محوّیت کا پیام ہوتی ہیں۔ خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضہ نہیں ہوتا۔

ازنگہ چشم تہی گشت وتماشا ماندہ ست
درزبانِ حرف نماندہ ست وسخنہائے ماندہ ست

ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے۔ اِدھر موسم ختم ہوا'اُدھر انھوں نے بھی دنیا کو خیرباد کہہ دیا ۔ گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن ان کے حصّے میں آیا تھا۔ وہی کفن کا بھی کام دے گیا۔

ہمچو ماہی غیر واغم پوشش دیگر نہ بود
تا کفن آمد' ہمیں یک جامہ بر تن داشتم

میر مبارک اللہ واضح عالمگیری کو یہی خیال پانی کا بُلبُلہ دیکھ کر ہوا تھا۔ دیکھئے کیا خوب کہہ گیا ہے۔

رشک فرمائے ولم نیست بجز عیش حباب
یافت یک پیرہن ہستی و آں ہم کفن ست

بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں۔ خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے' دوبارہ آموجود ہوتے ہیں۔ مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوۂ یک رنگی ویک ساختگی دیکھئے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھادی تو پھر دوبارہ مُڑ کے دیکھنا نہیں چاہتے۔ گویا ابُو طالب کلیمؔ کا اشارہ انہی کی طرف تھا۔

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نہ کرو' ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

پھولوں کے جمالیاتی (Aesthetics) منظر سے اگر نظر ہٹایئے تو پھر ایک اور گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ ان کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روحِ نباتی بھی روحِ حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں ابھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال وخواص کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے' کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے' اور پھر کہیں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جاسکتا ہے یعنے گلوری اوسا سیو پربا (Gloriosa superba) اسکی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں۔ چار بار آور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا' پھر پیار کی طرح اُلٹ جائے گا' پھر فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگے گا' پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لئے رک جائے گا' پھر دیکھئے' تو جن

منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا' انہی منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی۔ پھر اچانک یہ پیالہ اُلٹ جائے گا۔ گویا زندگی کے جامِ واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا۔

لئے بیٹھا ہے ایک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے چھ دن آنے میں لگتے ہیں چھ واپسی میں اور دراصل اس کا آنا بھی جانے کے لیے ہی ہوتا ہے۔

ترا آنا نہ تھا ظالم' مگر تمہید جانے کی

رنگت کے اعتبار سے بھی اس کی بُوقلمونیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ کلیاں جب نمودار ہونگی تو ہلکے سبز رنگ کی ہونگی' پھر جوں جوں کُھلنے کا وقت آنے لگے گا' زردی اُبھرنے لگے گی اور پھر زردی بتدریج سُرخی مائل ہونا شروع ہو جائے گی۔ پہلے آدھا سرخ آدھا زرد رہے گا۔ پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگے گی اور پورا پھول سرخ ہو کر مرچ کی پھلیوں کی طرح چمکنے لگے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے مگر یہاں اس کی شہرت نہیں۔

عالم ہمہ افسانۂ ما وار دو ما ہیچ!

یہ پھول نباتات کی اس قسم میں داخل ہے جسے اتحاد و تناسلی کے لئے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے کبھی ہوا کے جھونکوں سے اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے۔ اس پھول کا جزر جولیت اس کے انوثیت کے جزسے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادۂ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہ پہنچا دے تلقیح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ بار دار ہو جاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں۔ پودوں کے لئے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا۔ چنانچہ اکثر پھول بار دار ہو گئے۔

خیر' چمن آرائی کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو بلاقصد اتنا طُولانی ہو گیا۔ اب اصل حکایت کی طرف واپس ہونا چاہئے۔ فروری میں اَبر و باد کی آمد و رفت سے موسم کا اتار چڑھاؤ جاری رہا۔ مگر جونہی مہینہ ختم ہونے پر آیا۔ موسمِ بہار کا پیش خیمہ پہنچ گیا۔ یعنے معتدل ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے۔ پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ خراماں خراماں چلتی ہوئی خود بہار بھی آموجود ہوئی ہے' اور جوانانِ چمن نے اس کی خوش آمدید کا جشن منانا شروع کر دیا ہے۔

نفسِ باد و صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دِگر بار جواں خواہد شد!

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن دوپہر کے وقت کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اچانک کیا سنتا ہوں' بُلبل کی

نواؤں کی صدائیں آرہی ہیں۔

باز نوائے بُلبُلاں عشقِ تُو یاد می دہد!
ہر کہ ز عشق نیست خوش عمر بباد می دہد

باہر نکل کر دیکھا تو خطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں ایک جوڑا بیٹھا ہے اور گردن اٹھائے نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ بے اختیار خواجۂ شیراز کی غزل یاد آ گئی۔

صفیرِ مرغ بر آمد 'بطِ شراب کجاست
فغاں فتاد ز بلبل "نقابِ گل کے درید"

یہ علاقہ اگرچہ سرو سیر نہیں ہے لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہوا ہے 'اس لئے پہاڑی بُلبُلوں سے خالی نہیں ہے۔ یہ بلبلیں اگرچہ سرو سیر ایران کی بلبلوں کی طرح ہزار داستان نہیں ہوتیں لیکن رسیلے گلے کی ایک تان بھی کیا کم ہے۔ دوپہر کی چائے کا جو قیلولہ کے بعد پیتا ہوں ' آخری فنجان باقی تھا۔ میں نے اٹھایا اور اس نغمۂ عندلیب پر خالی کر دیا۔

تو نیز بادہ بہ چنگ آر در اہِ صحرا گیر
کہ مُرغِ نغمہ سرا سازِ خوش نوا آورد

دوسرے دن صبح بر آمدہ میں بیٹھا تھا کہ بُلبُل کے ترانے کی آواز پھر اٹھی۔ میں نے ایک صاحب کو توجہ دلائی کہ سننا بُلبُل کی آواز آ رہی ہے۔ ایک دوسرے صاحب جو صحن میں ٹہل رہے تھے کچھ دیر کے لئے گئے اور کان لگا کر سنتے رہے۔ پھر بولے کہ ہاں 'قلعہ میں کوئی چھکڑا جا رہا ہے۔ اس کے پہیوں کی آواز آ رہی ہے۔ سبحان اللہ! ذوقِ سماع کی دقّتِ امتیاز دیکھئے۔ بلبل کی نواؤں اور چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں میں یہاں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ہمائے گو مفگن سایۂ شرف ہرگز
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد!

خدارا انصاف کیجئے 'اگر دو ایسے کان ایک قفس میں بند کر دیئے جائیں کہ ایک میں تو بُلبُل کی نوائیں بسی ہوں ' دوسرے میں چھکڑے کے پہیوں کی ریں ریں 'تو آپ اسے کیا کہیں گے؟۔

نوائے بُلبلت اے گل کجا پسند افتد
کہ گوشِ ہوش بہ فرمانِ ہرزہ گو داری

اصل یہ ہے کہ ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کر دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بُلبُل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ملک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطا اور مینا کے پروں سے اُڑی اور دنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود!

بُلبُل کی جگہ یہاں کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں اور اس میں شک نہیں کہ اسکی کُوک درد آشنا دلوں کو غم والم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

بلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصے میں آیا ہے۔ موسمِ بہار میں باغ وصحراء ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائیں باغ ان کی نواؤں سے گُونج اٹھتا ہے بچے جھُولے میں ان کی لوریاں سنتے سنتے سو جائیں گے اور مائیں اشارہ کر کے بتلائیں گی کہ دیکھ یہ بُلبل ہے جو تجھے اپنی کہانی سنا رہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف جس قدر بڑھتے جائیں' یہ افسونِ فطرت بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک شخص نے شیراز یا قزوین کے گل گشتوں کی سیر نہ کی ہو' وہ سمجھ نہیں سکتا کہ حافظ کی زبان سے یہ شعر کس عالم میں ٹپکے تھے۔

بلبل بہ شاخِ سرو بہ گل بانگ پہلوی
می خواند درسِ مقامات معنوی
یعنی بیا کہ آتشِ موسیٰ نمود گل
تا از درخت نکتۂ تحقیق بشنوی
مرغانِ باغ قافیہ سنجند بذلہ گو
تا خواجہ مے خورد بہ غزل ہائے پہلوی

یہ جو کہا کہ مرغانِ باغ "قافیہ سنجی" کرتے ہیں' تو یہ مبالغہ نہیں ہے۔ واقعہ ہے۔ میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزار کو کافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لے بدلتی جائیگی اور ہر لے ایک ہی طرح کے اُتار پر ختم ہوگی جو سننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہوں گے۔ گھنٹوں سنتے رہئے ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں۔ آواز جب ٹوٹے گی' ایک ہی قافیہ پر ٹوٹے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ نوائے بُلبُل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے۔ جو ملک اس بہشت سے محروم ہے' وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر زمستان کی برف باری اور پت جھڑ کے بعد جب موسم کا رُخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ وصحرا پر چھا جاتی ہے' تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہوگئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضاء کا ایک

ایک ذرّہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھیں کھولئے تو حسن کی عُشوہ طرازی ہے، کان لگایئے تو نغمہ کی جاں نوازی ہے، سونگھئے تو سرتاسر بُو کی عطر بیزی ہے

صبا بہ تہنیتِ پیرِ مے فروش آمد
کہ موسمِ طرب و عیش و نائے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کُشا
درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنورِ لالہ چناں برفروخت بادِ بہار
کہ غنچہ عرقِ گشت و گل بہ جوش آمد

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بُلبُل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محوّیت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اس وقت انسانی احساسات میں یہ تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صورت سے ان کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہو گا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا۔ تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ و بُو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھے گا۔ پھر کُود پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا۔

بیا تا گل برافشا نیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
چو در دست ست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم

ہندوستان میں صرف کشمیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس عالم کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لئے فیضی کو کہنا پڑا تھا۔

ہزار قافلہ شوق می کشد شب گیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن افسوس ہے، لوگوں کو پھل کھانے کا شوق ہوا۔ عالمِ بہار کی جنّت نگاہیوں کا شوق نہ ہوا۔ کشمیر جائیں گے بھی تو بہار کے موسم میں نہیں۔ بارش کے بعد پھلوں کے موسم میں، معلوم نہیں دنیا اپنی ہر بات میں اتنی شکم پرست کیوں ہو گئی ہے؟ حالانکہ انسان کو معدہ کے ساتھ دل و دماغ بھی دیا گیا تھا۔

ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بُلبُل نینی تال اور کانگڑہ میں زیادہ سنا جاسکتا ہے۔ مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لئے کافی کشش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بُلبُلیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بُوٹے ہوتے ہیں اور اس لئے آجکل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہائٹ چیکڈ (White Cheeked) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاما کو اگرچہ عام طور پر بُلبُل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بُلبُل ہی تصور کرنا چاہئے مغربی یوپی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔

اس وقت بُلبُل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دیئے ہیں۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں جنہیں انگریزی میں (White Whiskered) کے نام سے پکارتے ہیں۔

ریڈیو پر ایک آواز خوش سنکر موسیقی کی تاریخ بیان کر ڈالی یہاں تک کہ اورنگ زیب کے زہد و ورع کا بھانڈا بھی عین چوراہے میں پھوڑ دیا کہ عالم شہزادگی میں زین آبادی کے شیفتہ و دلدادہ تھے اور بڑی منت و الحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا' اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا زین آبادی کے عین عروجِ شباب میں انتقال کی خبر دی اور اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کے مقبرہ کی نشان دہی کی اور یہ بھی بتایا کہ آج تک موجود ہے۔ زین آبادی کا حال بیان کرنے پہ آتے ہیں تو صاحب مآثر الامرأ کے حوالہ سے خان زمان کے ساتھ تعلقات سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ پری چہرگانِ خوش آواز اور مغنیّات عشوہ طراز اس کی سرکار میں جمع رہتی تھیں۔ انہی میں زین آبادی بھی تھی۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔

مولانا موسیقی کے فن سے بھی خوب آشنا تھے اور ستار کے زیادہ پرستار تھے۔ انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ مستیا خان سونی پت ضلع انبالہ (بھارت) کا رہنے والا تھا۔ وہ تلاشِ معاش کے سلسلہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ مولانا کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین کے عقیدت مندوں میں تھا۔ بعد میں اسے بیعت کی سعادت بھی حاصل ہو گئی تھی یہ موسیقی کا معلّم تھا۔ مولانا نے اسے اعتماد میں لے کر مدعا سے آگاہ کیا اس پر اسے حیرانی ہوئی' لیکن مرشد زادہ کی خواہش کی تکمیل کو کارِ ثواب جانا اور بجالانے پر بخوشی تیار ہو گیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں' تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی' لیکن اس وقت طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھایئے' پوری طرح اٹھایئے! اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جایئے۔ کوئی کام بھی ہو' لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا'

اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کئے' تو وہ بھی پوری طرح کئے۔ گناہ کے کام کئے' تو انہیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا' تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے' پارسائی کی راہ ملی' تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے' ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔ رسم و راہ رکھئے' تو راہ کے کاملوں سے رکھئے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا۔

تا دسترسم بود' زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا' تو جہاں تک راہ مل سکی' قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری تھی۔ بین سے بھی انگلیاں نا آشنا نہیں رہیں' لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا۔ اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا۔

کہ اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

اس عالم رنگ و بُو میں ایک روش مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

اور ایک بھونرے کی ہوئی کہ پھول پر بیٹھے' بو باس لی' اور اڑ گئے

تک دیکھ لیا' دل شاد کیا' خوش کام ہوئے اور چل نکلے

چنانچہ زندگی کے چمنستان ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا کچھ دیر کے لئے رک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے نا آشنا نہ رہے' کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا' دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی!
دل بھی اگر گیا' تو وہی دل کا درد تھا۔

حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں' تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں' حُسن ہے اور حُسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر' جس کے بے حِس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینۂ گرم نداری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات' عود مخر

میں آپ سے ایک بات کہوں! میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

رُوے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ست
این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجئے، آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانہ میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے، تو وہ ریڈیو سٹ کا فقدان ہے۔

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خُلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا۔ طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے، جو اگرچہ خود گذر گئے، لیکن ہمیشہ کے لئے دامن زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا، نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔

درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آکر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقع ہے کہ اس عالم میں بارہا، میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے، تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔

تو مپندار کہ این قصہ زخود میگویم !
گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست

اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنو جانے اور کوئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیات صائب کا ایک نسخہ خریدا تھا اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق ہے؟

این سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی

اسی قیام کے دوران میں مرزا محمد ہادی مرحوم سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور چونکہ علم وفن کی راہوں سے آشنا تھے، اس لئے علمی طریقہ پر اسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے۔ مجھے ان سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس، وہ بھی چل بسے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی!

اس زمانے میں کرسچین کالج کے سامنے پانچ روپے ماہوار کرایہ کا ایک مکان لے رکھا تھا وہی ان کی دنیا تھی، علمِ ہیئت کے شوق نے نجاری کے مشغلہ سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائر قطر اور نصف اور ثلث بنانے میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح اپنی رسد بندیوں کا سامان کرتے چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی، جست لگا کر اوپر پہنچتے اور پھر ساری رات ستاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے۔

کہ جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پرونیم!

کئی برس کے بعد پھر لکھنو جانے کا اتفاق ہوا، تو انہیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک رشتہ دار کے انتقال سے واپسی کی کچھ جائداد ورثہ میں مل گئی تھی اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفارہ کرنا چاہتے تھے۔

وقتِ عزیز رفت، بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت؟

یہ گرمجوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھری تھیں، اس لئے شاہدانِ نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتی تھیں اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا، لیکن

جتنے دن رہا، موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اوّل کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں۔ آج تک حجازیوں کا ذوقِ موسیقی غیر متغیر رہا یہ ذوق ان کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ اذان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں، لیکن اس زمانے میں حرم شریف کے ہر مینارہ پر ایک مؤذّن متعین ہوتا تھا اور ان سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ المؤذّنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات پچھلی پہر میں ان کی ترجیم[1] کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصرو شام کے سفر کا اتفاق ہوا، تو موجودہ عربی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدما کی بہت سی مصطلحات جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی وغیرہ میں ملتی ہیں، اب کوئی نہیں جانتا۔ تعبیر و تقسیم کے اسماء و رموز تقریباً بدل گئے ہیں اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا، وہ اب پھر عربی میں واپس آکر معرّب ہو گئی ہیں، البتہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہی راگنیاں اب بھی اصل بنیاد کا کام دے رہی ہیں، جو یونانی موسیقی کی تقلید میں واضح ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ برجوں کی طرف اب بھی انہیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے جس طرح قدماء نے کیا تھا۔ آلاتِ موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن عُود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں اور ان کے زخموں سے وہ نوائیں اب بھی سنی جا سکتی ہیں جو کبھی ہارون الرشید کی شبستانِ طرب میں اسحاق موصلی اور ابراہیم بن مہدی کے مضراب سے اٹھا کرتی تھیں۔

ایں مطرب از کجاست کہ ساز "عرق" ساخت

واہنگ بازگشت زراہِ "حجاز" کرو

عراق "اور" حجاز " دو راگنیوں کے نام ہیں۔ اور راہؔ یعنی " سر

مطرب نگاہ دار ہمیں " رہ " کہ میزنی

اس زمانے میں شیخ احمد سلامہ حجازی کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا " جوق " وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں منڈلی کے لئے " طائفہ " کا لفظ اختیار کیا تھا۔ پھر اس کی جمع

---

1 ○ صبح کی اذان سے پہلے مختلف حکمات ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے " ترجیم " کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی۔ کیونکہ ملا علی قاری اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع و محدثات میں سے شمار کیا تھا۔

"طوائف" ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لئے، یعنی زبان رقاصہ ومغنیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلامہ کاجوق قاہرہ کے اوپرا ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا اور شہر کی کوئی بزم طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اس کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے' وہ اس کا پورا ماہر تھا ایک دوست کے ذریعہ اس سے شناسائی پیدا کی تھی اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کئے تھے۔

اس زمانے میں مصر کی ایک مشہور "عالمہ" طاہرہ نامی باشندہ طنطا تھی۔ "عالمہ" مصر میں مغنیہ کو کہتے ہیں۔ یعنی موسیقی کا علم جاننے والی' ہمارے علمائے کرام کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں یہی لفظ (Alma) ہو گیا ہے۔ شیخ سلامہ بھی اس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی' مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش وایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سنے' دیکھئے' اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی'

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں' اس سے کئی سال بعد مصر میں اُمِّ کلثوم کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سنے ہیں اور قاہرہ' انگولا' طرابلس الغرب' فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو سٹیشن آج کل بھی اس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے اُمِّ کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے' وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کے مشہور انشادات میں سے ایک نشید عُلیہ بنت المہدی کا مشہور نسیب ہے۔

وحب، فان الحب داعية الحب

ولم منبعيد الدار مستوجب القرب

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور دقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حُسنِ تقسیم اور دقتِ ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے۔ لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے' اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کا موجودہ فنِ موسیقی جس کی بنیاد نشاۃ ثانیہ (Renascence) کے باکمالوں نے رکھی تھی' منتہائے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور گو ذوقِ سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اس کی پوری قدر شناسی نہ کر سکیں' لیکن دماغ اس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء ومعانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات والحان کی

تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزاء کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائے گا، موسیقی کی گہرائیاں اتنی ہی بڑھتی جائیں گی۔ اس اعتبار سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فنِ موسیقی فکرِ انسانی کی دقت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالان فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحر کاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزاء کو وزن کو تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزاء کو حُسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے۔

تو حنا بستی و من معنیِ رنگین بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ وہی موسیقی میں الحان وایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے، لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا اس نے اپنی روحِ معنی کے لئے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا۔

والاذن تعشق قبل العین احیانا !

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد والم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں، بعض کے سننے سے مسرّت وانبساط کے جذبات امنڈنے لگتے ہیں؟ بعض کی لے ایسی محسوس ہوتی ہے، جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ۔

یاراں! صلاے عام ست، گرمی کنید کارے

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں ابھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شیلے (Shelley) کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ (Words worth) کی حقائق سرائیاں۔

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کہ تمام علوم وفنون میں دلچسپی لی، لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابو ریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم وعقائد پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب فی کتبہم فی سائرا العلوم پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ (Sachau) نے لاثارالباقیہ کے مقدمہ میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا تھا، لیکن اس میں بھی اس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی، حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نائک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے

درباروں میں اپنے کمالاتِ فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی کوچوں میں بجائے جارہے تھے۔ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علومِ عقلیہ کے شوق واشتغال نے اس کی بہت کم مہلت دی کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کرتے اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بمشکل آشنا ہوسکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنّف یک قلم نا آشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا، حالانکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنون ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا، یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انہیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر اور سوناکلیس وغیرہما کے نام انہیں ارسطو کے مقالات اور افلاطون کی جمہوریت سے معلوم ہوگئے تھے، لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کرسکے۔ ابنِ رشد نے "کامیڈی" اور "ٹریجڈی" کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یونانی ڈرامہ کی حقیقت سے اس کا دماغ کس درجہ آشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدّح سے تعبیر کرتا ہے!

یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونانی فنِ بلاغت سے ائمۂ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے! بظاہر انہوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا! ارسطو کے مقالات خطابت اور شاعری پر عربی میں منتقل ہوگئے تھے اور ابنِ رشد نے اپنی شروح میں انہیں بھی شامل کیا۔ لیکن عرب ائمۂ فن نہ تو اس کی روح سمجھ سکے اور نہ بلاغتِ عربی کی سرگرانیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ تمام تر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے اور عربی دماغ ان سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ کی نقد الشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقہ میں اس کا نشوونما ہوا تھا اور وہ نسلاً رومی تھا۔ چند سال ہوئے اسکوریال (اسپین) کے کتب خانہ میں ایک کتاب کا سراغ ملا، جس کی لوح پر نقد النثر درج تھا، مگر مصنف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابو جعفر ابن قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈھی گئی، تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانہ میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطان مراکش کے دو جہازوں کی لوٹ سے اسپین کے ہاتھ آئی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں، اس لئے انہیں ضائع نہیں کیا گیا اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً نسخہ بھی اسی لوٹ میں آگیا ہوگا پچھلے دنوں جامعہ عصریہ کے ادارہ نے اس کا عکس حاصل کیا اور ڈاکٹر مقصود اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر شائع ہوگیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدمے بھی لکھے ہیں۔ بظاہر اس میں

شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی نقد الشعر کے مصنف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ رسالہ کے اسلوبِ بیان میں منطقی طریقِ بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے' جو آگے چل کر فن بلاغت پر بالکل چھا گیا۔ لیکن اصولِ فن خالص عربی ہیں اور مثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پر چھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بلاغت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندوستان کے بعض اقوال جاحظ کے حوالہ سے نقل کر دیئے ہیں! اور وہ سب نے نقل کئے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا' وہ اس کے فنِ موسیقی سے برت نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ خود عربوں کا فنِ موسیقی کچھ نہ تھا اور جتنی کچھ عمارت بھی انہوں نے اٹھائی تھی' اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا۔

نوائے بار بد ماند ست در ستاں

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فنِ موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی برجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں قانون اور ارغنون (آرگن) عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابو نصر فارابی نے قانون پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اخوان الصفا کے مصنفوں کو بھی موسیقی سے اعتنا کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے جو ان اطراف میں رائج ہوگی' ضرور آشنا ہوئے ہوں گے؟ لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا' ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لئے غیر ملکی نہیں رہے تھے' بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے' چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہد فن کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ ساز گری' ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے' دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قرآن السعدین میں خود کہتے ہیں۔

زمزمۂ "ساز گری" در "عراق"
کردہ بکلبانگ عراق اتفاق

قول ' ترانہ سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ گویئے کی زبان پر ہیں ' حالانکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں ' کلاسیکل موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالبًا مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ ملتان ' ایودھن ' گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت وقبولیت کے لئے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے تھے۔ جہاں تک سلاطینِ ہند کا تعلق ہے ' خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدر دانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں ' لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بحیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا۔ وہ غالبًا جونپور کا شرقی خاندان تھا چنانچہ اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہلِ فن اعتنا کرنے لگے ' اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا شوق ذوق نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم وعمل کا تخت گاہ بن گئی تھی ' اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری کے اس اقلیم گاہ کا جگت گورو تھا اور اس کے شوقِ موسیقی نے بیجا پور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے '

مروت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

مالوا ' بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی ' دونوں کے سرپرست تھے ' چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام ترانہی کی سرپرستی میں نشوونما پائی۔ مالوا کے باز بہادر کو توروپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی! آج تک مالوا کے گھروں سے اس کے دہروں کی نوائیں سُنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدرشناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا ' اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے ان تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے ' جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہوگئے تھے اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں جابجا ایسے اشارے کئے ہیں ' جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے ' اس کی حُسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس ہو۔ چنانچہ شاعری ' مصوّری اور موسیقی تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجہ کا کمال شناس تھا۔ اس کے درباری جس درجہ کے شاعر ' مصوّر اور گویّے جمع ہوگئے تھے ' پھر ہندوستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے ایک مصوّر نے الزبتھ کے سفیر کو اپنا کمال دکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کے لئے اس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے۔

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دلِ شکستن توبصد خوں برابرست

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانشمندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ امراء اور شرفاء کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے جس طرح تمام فنونِ مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا' اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا' ملک کے ہر حصہ سے سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی اور دہلی' آگرہ 'لاہور اور احمد آباد کے گویئے بڑی بڑی تنخواہوں پر امراء اور شرفاء کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو نوجوان تکمیلِ علم کے لئے بڑے شہروں میں آتے' وہ وہاں کے عالموں اور مدرسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈتے اور پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوے تحصیل تہہ کرتے۔ دکن میں احمد نگر' بیجا پور اور برہان پور کے اہل فن مشہور تھے۔ دو آبہ میں دہلی اور آگرہ کے اور پنجاب میں لاہور' سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل واشراف آتے۔ وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے تھے کہ اس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد بن قاسم فرشتہ صاحب تاریخ کا باپ مازندران سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی' لیکن اسے ہندوستانی موسیقی سے اس قدر شغف ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی' یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ خلاء الملک تونی جو جلوسِ شاہجہانی کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل خان کے خطاب سے مخاطب ہوا اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدہ وزارت پر فائز ہوا۔ ہندوستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اس سے استفاضہ کرتے تھے۔

اس عہد کے کتنے ہی مقدّس علما ہیں جن کے حالات پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے' لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ مُلّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا۔ اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا گیتا ہے"!

ملا عبدالقادر بدایونی جیسا متشروع اور متصلّب شخص بھی بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی سفارش کرتے ہوئے اس مشّاقی کا ذکر کر دے علّامہ سعد اللہ شاہجہانی جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہتِ طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں۔ موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ ان کے استاد ملّا عبدالسلام لاہوری تھے۔ ان کے حلقۂ ذوق کی عالمگیریوں نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخّر کر لیا تھا اور جب شاہ جہاں نے

شہزادوں کی تعلیم کے لئے تمام علمائے مملکت پر نظر ڈالی تھی' تو نظرِ انتخاب نے انہی کی سفارش کی تھی۔ لیکن اس کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مقامات حل کیا کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے' شیخ معالی خان جو ملا طاہر پٹنی محدث گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے ان کے حالات میں صاحبِ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں کہ سر آمد علمائے عصر تھا اور شاہجہان کے دربار میں اس کا مباحثہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے' ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالانِ فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا حکیم برنیر فرنساوی صاحبِ سفرنامۂ ہند اسی دانشمند خان کی سرکار میں ملازم تھا اور غالباً اسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔

شیخ علاؤالدین جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گذرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے۔

ندانم آں گلِ رعنا چہ رنگ و بُو دارد
کہ مرغِ ہر چمنے گفتگوئے اُو دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بمنتہی برسید
ہنور ساقیِ بادہ در دارد

ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشّاق تھے

شیخ جمالی صاحبِ میر العارفین اور ان کے لڑکے شیخ گدائی دونوں کا فنِ موسیقی میں توغل معلوم ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد فنِ موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سَر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصور کرتے۔

شیخ عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوف میں ان کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں ان سے گرم ہوتی تھیں۔

بیرم خاں موسیقی ہند کا بڑا قدر شناس تھا اور اس کے لڑکے عبدالرحیم خان خاناں کی قدر شناسیاں تو اس درجہ تک پہنچ گئی تھیں کہ اکبر اور جہانگیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی کے خاتمہ میں جہاں ان علماء و شعرا کا ذکر کیا ہے' جو خانخاناں کی سرکار سے وابستہ

تھے، وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ ان میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ شاہنواز خان صفوی کے حالات میں صاحبِ مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ شیفتۂ موسیقی بود و خوانندہ ہا و سازندہ ہا کہ پیش خود جمع کردہ بود، نظیر نداشتند " قریب قریب یہی الفاظ ہونگے حافظہ سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گزر گئے۔ زین خان کوکہ کا علوم درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے میں بھی اس نے درس و تدریس علوم کا مشغلہ باالتزام جاری رکھا تھا، لیکن اس کے حالات میں بھی سب لکھتے ہیں کہ " بکجت و راگ شغفے داشت، و ساز ہابکمال حسن و خوبی مینواخت" اس کالڑکا مغل خان بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ خان کلاں میر محمد جو شمس الدین اتگہ کا بھائی تھا۔ موسیقی ہند کے علم و مہارت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ مرزا غازی خان بن جانی بیگ حاکم سندھ و قندھار کی نسبت سب لکھتے ہیں کہ نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا۔ ملّا مرشد یزد جردی نے اسی کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی۔

گر نغمۂ سازت بسلوں می آید رمزے ست بگوییت کہ چوں می آید
از بسکہ بگردِ زخمہ ات می گردد پیچیدہ زطنبور بروں می آید

خان زمان میر خلیل نے جو یمین الدولہ آصف خان کا داماد تھا، اس فن میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی، کہ لوگ اپنے اختلافات اس کے آگے فیصلہ کے لئے پیش کرتے۔ سرس بائی جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی۔ اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا تو سرس بائی بھی تیار ہو گئی کہ اس کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے۔ چنانچہ مراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی۔

مرزا عیسیٰ خان ترخان جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی شورش برپا کی تھی نغمہ سنجی اور سازنوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اس وقت حافظہ کی گرہیں کھلنے لگی ہیں، تو بیشمار واقعات سامنے آرہے ہیں۔ شہزادہ خرم کی ماں مان متی جو راجہ ادے سنگھ کی بیٹی تھی، جب جہانگیر کے محل میں آئی، تو اس کے گانے کا محل میں شہرہ ہوا۔ جہانگیر چونکہ خود ماہرِ فن تھا، اس لئے اس نے امتحان لیا اور جب دیکھا کہ امتحان میں پوری اتری تو بہت خوش ہوا اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں تیار کرے۔ خود خرم یعنی شاہجہاں کے ذوق و مناسبتِ فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خان اس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا، دھرپد میں شاہجہاں کے رسوخِ ذوق کا مؤرخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا

شوق دلایا، تاکہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکے، اس کے حالات میں صاحبِ شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبان سنسکرت سے واقف اور موسیقی سنگیت میں ماہر تھا۔

اس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقیِ فن کے لئے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی کا پوتا اسلام خان جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبیدار ہوا، تو اس کی سرکار میں اسی ہزار روپے ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا، صاحبِ مآثر الامرا لکھتے ہیں کہ اس کے دسترخوان پر ایک ہزار لنگریاں[1] کمال تکلف و اہتمام سے دونوں وقت چنی جاتی تھیں، مگر خود اس کا یہ حال تھا کہ جوار کی روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عمر بھر جامہ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتا پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ[2] اوڑھتا۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشف سے اگرچہ فنون لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی، مگر یہ جو کچھ ہوا صرف دربارِ شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشہ میں جو نہریں رواں کر دی تھیں، وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔ بلاشبہ عالمگیری عہد میں شاہی سرکار کے کارخانے بند ہو گئے تھے۔ لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کر سکتا تھا۔ میں نے اس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فقیر اللہ سیف خان نے مرتب کی تھی جو اسی عالمگیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح تھا۔ شیر خان لودھی صاحب مراۃ الخیال بھی اسی عہد میں تھا، جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی، دونوں میں دستگاہ پیدا کی اور پھر دونوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مراۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے اور اپنے ذوقِ فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اس کی کتاب میری نظر سے گذر چکی ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس سلسلہ میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیّہ تھی جو "زین آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی، اور اس کے نغمہ و حسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانۂ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثر الامرا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر لکھا ہے۔

---

(۱) "لنگری" لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے طشت کی طرح بڑی ہوتی تھی اور مسلم گوسفند بریاں اس میں رکھا جا سکتا تھا۔

(۲) "طاقیہ" ہلکی ٹوپی کو کہتے ہیں، جو لوگ سر پر رکھ لیتے ہیں۔ آج کل بھی عرب میں اس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں۔

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق رُبائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولو العزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنادیا تھا۔ لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

گذر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے، اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی، ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغِ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لئے آئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایہ میں سے گذرا، جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے، جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا، زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا، نہ اس کی خالہ کا، بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخِ بلند سے ایک پھل توڑ لیا، خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گذری اور اس نے ملامت کی، تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا۔

بالابلندِ عشوہ گرِ سروِ نازِ من
کوتاہ کرد قصّۂ زہدِ درازِ من

صاحبِ مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ "بکمالِ ابرام و سماجت زین آبادی را از خالہ محترمہ خود گرفت۔ با آں ہمہ زہدِ خشک تفقہ بحت، شیفتہ و دلدادہ اوشد۔ قدحِ شراب بدستِ خود پر کردہ می داد۔ گویند روزے زین آبادی ہم قدح بادہ پُر کردہ، بدستِ شہزادہ داد و تکلیف شرب نمود"۔ یعنی بڑی منت والحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہدِ خشک اور خالص تفقہ کے جس کے لئے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا، اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگالے۔ دیکھیے عرفی کا ایک شعر کیا موقعہ سے یاد آگیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے۔

ساقی توئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک مے گسار شد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کی کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو!

مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو خمار باقیست

لیکن اس عیّار کو رحم نہ آیا۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آں دو چشمِ نا مسلماں را!

ناچار شہزادہ نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگالے۔ گویا ولقد همت به و هم بها کی پوری روداد پیش آگئی۔

عشقش خبر زعالمِ مدہوشی آورد
اہلِ صلاح را بقدح نوشی آورد

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بےبس ہو کر پینے کے لئے آمادہ ہو گیا ہے، فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا "غرض امتحانِ عشق بود، نہ تلخ کامی شما"

ایں جورِ دیگر ست کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کند کہ بہ آزار خو کنند!

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہاں تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ دارا شکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعایت و غمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ ببینید ایں مزور ریائی چہ صلاح و تقویٰ ساختہ است؟ ہا، فیضی نے کیا خوب کہا ہے۔

چہ دست مے بری اے تیغ عشق اگر داد ست
ببر زبان ملامت گر زلیخا را!

نہیں معلوم، اس مغنّیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا، لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا، یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

خود رفتہ ایم و رکنج مزارے گرفتہ ایم
تا بارِ دوشِ کس نشود استخوانِ ما

آپ نے عاقل خاں رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا، لیکن اسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر وابستگانِ دولت کو تعجب ہوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا! جب اورنگ زیب شکار کے لئے محل سے نکلا، تو عاقل خان نے کہ میر عسکر تھا، تنہائی کا موقعہ نکال کر عرض کیا، "اس غم و اندوہ کی حالت میں شکار کے لئے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہو گا جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی"۔ اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خان کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا۔

عشق چہ آسان نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت!

اورنگ زیب پر رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے! عاقل خان نے کہا، اس شخص کا ہے، جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خان کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اس دن سے اس کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی۔ اس حکایت میں جس "پرستارِ خاص" کی موت کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مقصود یہی "زین آبادی" ہے۔

صاحبِ مآثر الامرا نے خان زمان کے حال میں لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا، اور کاروبارِ منصب کے انہماک کے ساتھ راگ ورنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگان خوش آواز اور **مغنیاتِ** عشوہ طراز اس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ انہی میں "زین آبادی" بھی تھی، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا، کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اسکی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی، اس لئے اس کے **اشتغال** وذوق سے کنارہ کش ہو گیا اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ بند کر دیا۔ گویوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا، تو اس نے کہا: "اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اٹھ سکے"۔ لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا جس طرح انگلستان میں پیوریٹین (Puritan) عہد کی خشک مزاجیاں اعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھیں، اسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد کی تردماغیاں دراصل اسی عالم گیری خشک

مزاجیوں کا ردِ عمل تھا۔ سید عبدالجلیل محدث بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے 'اس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے۔ جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے آرام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکار قمرغہ کے سروسامان میں داخل ہوئی اور اس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص نے مراۃ المصلحات میں اس طریقِ شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکار قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیئے جاتے تھے اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محویت انہیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکار قمرغہ کا قصد کیا اور اس رقص و سرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے تو نور جہاں کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ اُمیدِ آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرتِ مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لئے ہاتھ اٹھائے' دل گرفتہ واپس آ گیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں' دنیا کی تمام قوموں کی قدیم روایتوں میں پایا جاتا ہے' تورات میں ہے کہ حضرت داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدمائے فن نے تو اسے ایک مسلمہ حقیقت مان کر اپنے بے شمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدہ پر استوار کی تھیں۔ سانپ' گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حدی کی لے اگر رک جاتی ہے' تو محمل کی تیز رفتاری بھی رک جاتی ہے۔

حدی را تیز تر میخواں چوں محمل را گراں بینی

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔ اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو' تو اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے' وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہئے' صرف اپنے راگ کے زور سے لگائے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے' جانوروں کی اس محویت و تسخیر کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں' حالانکہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جزیرہ سرندیپ کا ذکر کیا ہے' لکھتا

ہے 'یہاں بندر بہت ہیں' ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر ان کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں' پڑھنے لگے 'تو بندر اس کے مطیع ہو جائیں گے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی۔ یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا۔ اشعار کی لے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہوگی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو فی ذکر علوم لھم کاسرۃ الاھجہ علی افق الجھل کے عنوان سے ہے اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملے گی جو فی معارف شتی من بلادھم والنہار ہم کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا **علم الحیوان** اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علّتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا حاسّہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی صاحب ریاض الشعراء' قزلباش خان امید' امیر مُعز فطرت موسوی مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری' یہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے' لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ موسیقیِ ہند سے واقفیت پیدا کئے بغیر اپنی دانش و شائستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے' اس لئے اس کی تحصیل ناگزیر ہے۔ قزلباش خان امید کی مجالسِ طرب کا حال قاضی محمد صادق خان اختر نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فن میں کس درجہ دستگاہ اسے حاصل ہوگئی تھی۔ شیخ علی حزیں ایرانی موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے' لیکن ہندوستان میں انہوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں ان کا یہ دستور تھا کہ ہفتہ کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لئے مخصوص کر دیئے تھے' شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دور میں تفصیل حسین خان علّامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی' شوستری صاحب تحفۃ العالم کلکتہ میں ان سے ملا تھا' جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علومِ عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا' ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہرِ فن سازندہ صرف اس کام کے لئے ملازم ہے کہ شب کو خواب گاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل میں بحر العلوم کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں ان کا رُسوخ عام طور پر مسلّم تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اشتغال تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کا باعث ہوتا ہے وہی دور تنزل میں فکر کے لئے آفت اور طبیعت کے لئے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسنِ استعمال اور اعتدال سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی

اور صد عیبی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا' تو مجلسِ سماع ونشاط سے ان کی تھکن مٹاتا اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں' دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا' تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا' تو تازہ دم ہونے کے لئے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقعہ دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو تھا' مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا' وہ محتاجِ بیان نہیں

سارت مشرقة وسرت مغرب

شستان بين مشرق ومغرب

اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے' حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہانے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی بابِ قضا سے تھا' نہ کہ بابِ تشریح سے قضا کا میدان نہایت وسیع ہے' ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسد کا وسیلہ بن جائے قضاًرو کی جا سکتی ہے' لیکن اس سے تشریح کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل جا سکتا۔ قل من حرم زينة الله التى اخراج العباده والطيبات من الرزق ؟ لیکن یہ مبحث میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جا رہی ہے' وہ دوسرا ہے۔

مومن! آ' کیشِ محبت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزا میر نہ کھینچ

دیکھیے' بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے' تو معلوم ہوا کہ فل سکیپ کے چھبیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں' بہرحال اب قلم روکتا ہوں۔

حرف نامنظورِ دل' یک حرف ہم بیش ست دبس
مغنیئے دلخوارہ گر صد نسخہ باشد' ہم کم ست

مولانا نے غبارِ خاطر کے مکتوبات قلعہ احمد نگر کے زمانہ میں لکھے' ان کا حافظہ اور یادداشت واقعی قابل داد تھے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے جاتے تھے۔ فارسی' عربی اور اردو کے منتخب اَن گنت اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ جن سے عبارت کو مزین کرتے تھے۔ ان کی تعداد کسی کو معلوم نہیں اور غالباً وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ لکھنے بیٹھتے تو شعر ہاتھ باندھے قطار اندر قطار کھڑے ہوتے جس طرح مغلوں کے دربار میں کنیزیں۔ اگرچہ غبارِ خاطر نثر میں شاعری ہے لیکن ہر دو چار سطروں کے بعد شعروں کو موقع اور محل کے مطابق اس خوبصورتی سے جڑتے ہیں' جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ الفاظ' تراکیب'

معانی ، مطالب ، ادائے مطالب اور اسلوبِ نگارش غرض ہر راہ پر منفرد ، طرزِ عام سے گریز ، تقلید و پیروی سے پرہیز ، مجتہدانہ روش اور ایجاد اور اعجاز ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ پھر زندگی کی جس راہ پر بھی نکلے کاملوں سے رسم و راہ رکھی ، خام کاروں سے نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا تھا۔ کہ ان کا دماغ عجائبات زمانہ میں سے ہے اور کسی علمی نمائش گاہ میں رکھنے کے قابل ہے۔

اگست 1942ء سے اپریل 1945ء تک مولانا قلعہ احمد نگر میں نظر بند رہے۔ جنگ کے حالات نے پلٹا کھانا شروع کیا اور اتحادی فوجیں فتح و کامرانی سے ہمکنار ہونے لگیں تو زندانیوں کو سخت فوجی نگرانی میں رکھنے کی احتیاج نہ رہی۔ لہٰذا انہیں عام جیل خانوں میں سول حکام کی نگرانی میں دینے کا فیصلہ ہوا۔ سب سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور شنکر راؤ دیو کے لئے قلعہ احمد نگر کا آہنی پھاٹک تین سال بعد کھلا اور پونا جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ دہلی کے سیاسی قیدی عام طور پر بٹالہ جیل میں رکھے جاتے تھے۔ آصف علی کو یہاں بھیج دیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے الہ آباد کے قریب نینی جیل میں رکھا گیا اور بعد میں الموڑا جیل میں منتقل کر دیا۔ مولانا کو سب سے آخر میں نکالا گیا ایک غیر آباد ریلوے سٹیشن سے ٹرین میں سوار کر کے بنگال کے ایک مقام بنکورا میں ایک دو منزلہ بنگلہ میں رکھا گیا[1]۔ جب گاڑی آسنسول پہنچی تو پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ حکومت کی جانب سے مولانا کی منتقلی کو صیغۂ راز میں رکھنے کے باوجود اخباروں کو پتہ چل گیا اور کلکتہ کے کچھ نامہ نگار آسنسول پہنچ گئے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نواب آف ڈھاکہ کا رشتہ دار تھا۔ اس نے مولانا سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ اگر وہ عوام سے ملنا چاہیں تو وہ روکے گا نہیں لیکن اسے حکومت کی باز پرس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مولانا نے اس کی بے بسی دیکھتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا یا حکومت کی نظر میں معتوب کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ مولانا اوپر کے کمرے میں چلے گئے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ حالات کی تبدیلی نے سب کچھ بدل دیا تھا کہاں تو یہ عالم تھا کہ احمد نگر کے زندانیوں کو باہر کی ہوا نہ لگنے دی جاتی تھی۔ ساڑھے تین برس کے عرصہ میں شاید ہی کسی باہر کے ہندوستانی کی شکل دیکھی ہو ، ایک دو مرتبہ عمارت کی مرمت کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لئے بھی ہندوستانی مزدوروں سے کام نہیں لیا گیا ، اور اب یہ حالت تھی لوگ کلکتہ ، الہ آباد اور لکھنؤ سے آئے تھے۔ مولانا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ان سے خطاب کیا اور ہنس کر کہا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹروں کی پریشانیاں دم بہ دم بڑھتی جا رہی ہیں اور میں نہیں

---

۱ (۱) ..... قبل ازیں جب مرکزی حکومت نے زندانیوں کو اپنے آبائی شہروں میں منتقل کرنے کے لئے صوبائی حکومتوں سے رابطہ کیا تو حکومتِ بنگال نے مولانا کو صوبہ میں منتقل کرنے کی مخالفت کی تھی۔ (نوائے وقت لاہور ۱۰ر اپریل ۱۹۴۵ء)
یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگی تھیں کہ مولانا کو اسپیشل جیل میں رکھا جائے گا۔ (نوائے وقت لاہور ۲۱ر اپریل ۱۹۴۵ء) کیونکہ مولانا نے خرابیٔ صحت کی بنا پر رہائی سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو جو خط لکھا تھا اس میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں: ”میرے لئے خرابیٔ صحت کی بنا پر رہائی کا تخیل سخت تکلیف دہ ہے۔ (نوائے وقت لاہور ۱۲ر مئی ۱۹۴۵ء)

چاہتا کہ گرمی میں ان کو دردِ سر ہو جائے۔ مولانا نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اپنے ڈبے میں سوار ہو گئے جو پہلے سے ان کے لئے ریزرو کرایا جا چکا تھا۔ بنکورا کے ریلوے سٹیشن پر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے افسران نے مولانا کا استقبال کیا اور انہیں ایک بنگلہ میں پہنچا دیا گیا۔ جس کا انتظام حکومت نے پہلے سے کیا ہوا تھا۔ 15 ر جون 1945ء کی ایک شام کو آل انڈیا ریڈیو نے خبروں میں بتایا کہ مولانا اور ان کے رفقاء کی رہائی کے احکامات حکومت نے جاری کر دیئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی ریڈیو پر یہ خبر سنی لیکن حکومت کی جانب سے اسے اطلاع موصول نہ ہوئی تھی۔ آدھی رات کے وقت جیلر نے مولانا کو اطلاع دی کہ اسے رہائی کے احکام موصول ہو گئے ہیں۔ رات چونکہ زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لئے کوئی کارروائی نہ ہو سکتی تھی۔ دوسرے دن صبح ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مولانا سے ملنے کے لئے آیا اس نے رہائی کا حکم سنایا اور بتایا کہ کلکتہ ایکسپریس پانچ بجے شام بنکورا سے روانہ ہوتی ہے۔ اس میں مولانا کے لئے ایک فرسٹ کلاس کوچ ریزرو کرا دیا گیا ہے۔

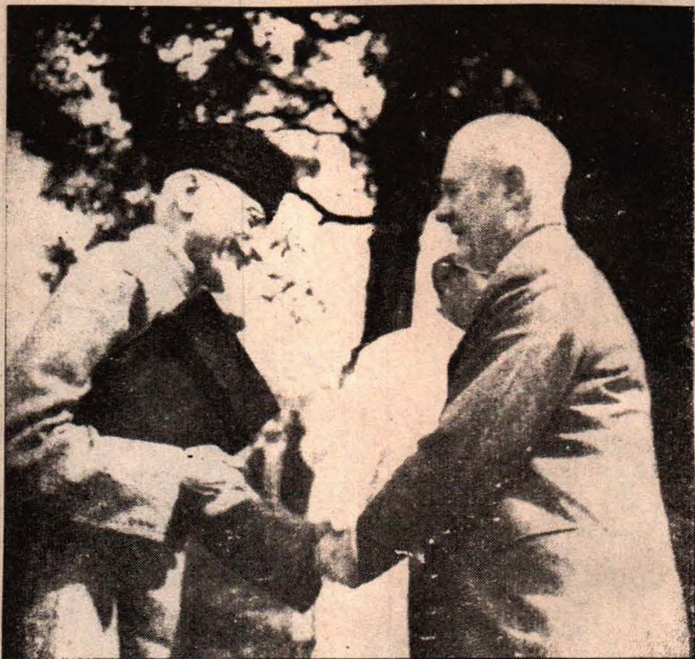
رہائی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کلکتہ سے نامہ نگار مولانا سے ملنے کے لئے پہنچ گئے۔ مقامی عوام بھی ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ سہ پہر کو مقامی کانگریس کمیٹی نے ایک پبلک میٹنگ کا انتظام کیا جہاں مولانا نے ایک مختصر سی تقریر کی اور کلکتہ جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اگلی صبح وہ ہوڑا اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں ان کا زبردست استقبال ہوا وہ بڑی مشکل سے اپنے ڈبے سے باہر نکلے اور کار میں سوار ہو سکے۔ کار میں ان کے ساتھ بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبانیا پربھا تا اور دوسرے مقامی لیڈر تھے۔ مولانا نے ''انڈیا ونز فریڈم'' میں کہا ہے کہ جس وقت کار پل پر سے گزر رہی تھی، مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا، تین سال پیچھے کا وہ زمانہ یاد آیا۔ جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا۔ مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا:

مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے اور ہائے   میری دنیا کیسی بدل گئی ہے

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا۔ کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی میں نے ان میں سے ایک ہار لیکر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا۔

وضع داری اور ضبط و تحمل مولانا کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ لیکن اپنی اہلیہ کی قبر پر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دل کی بھاپ پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلی۔ وہ دیر تک سر جھکائے آنسو بہاتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلیہ کی وفات کے غم سے وہ شاخِ بریدہ ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے غبارِ خاطر میں کیا ہے ملیح آبادی لکھتے ہیں:۔

''نظر بندی سے چھوٹ کر مولانا گھر پہنچے۔ اسی وقت میں بھی حاضر ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔''

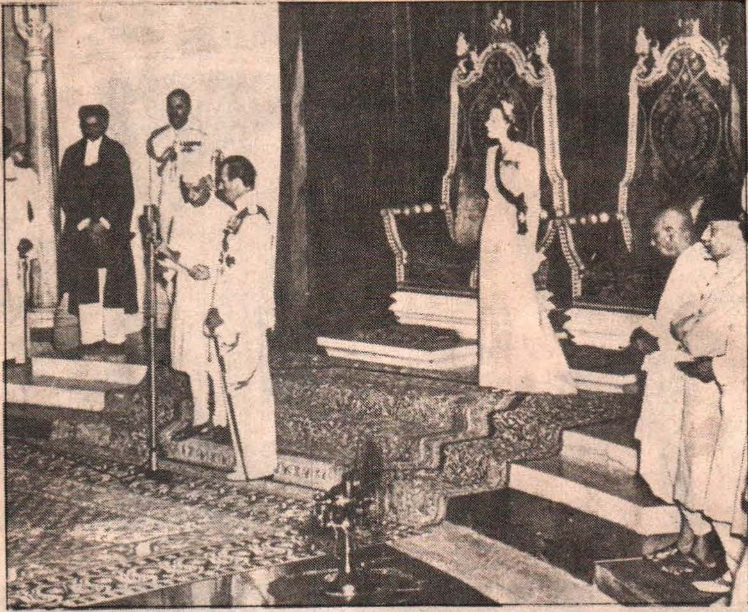


ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مولانا آزاد
کو پہلی شملہ کانفرنس کے موقع پر خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۴۵ء

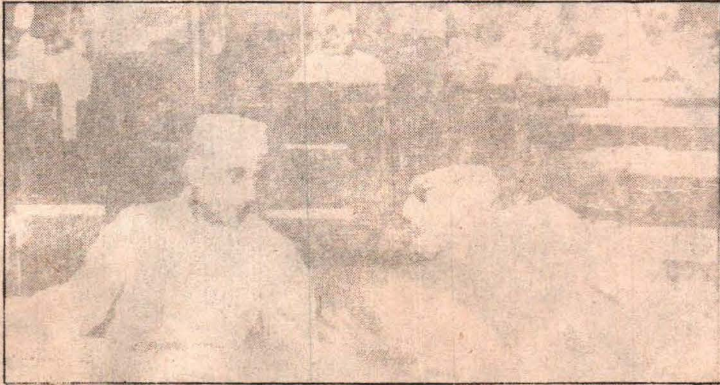


Mr. Gandhi leaving Viceregal Lodge, 11 July 1945

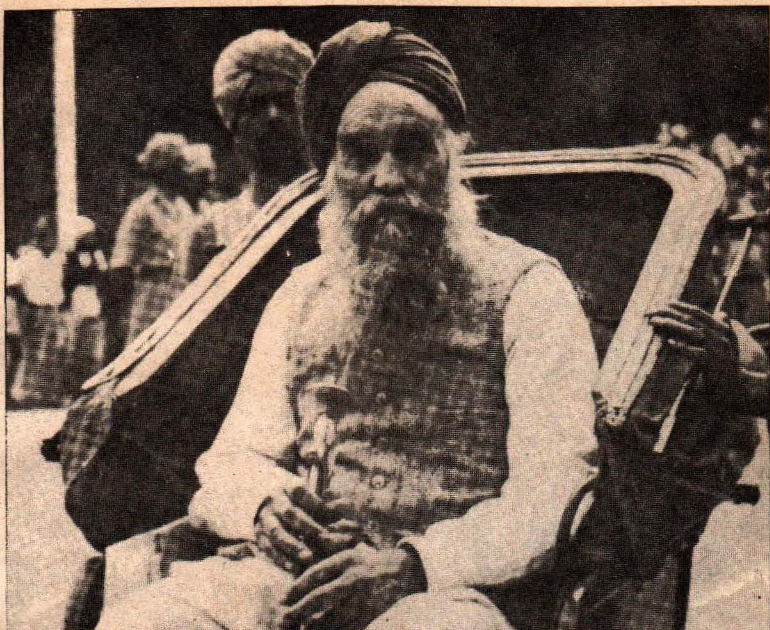
مسٹر گاندھی وائسرائیگل لاج سے باہر آرہے ہیں۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۵ء



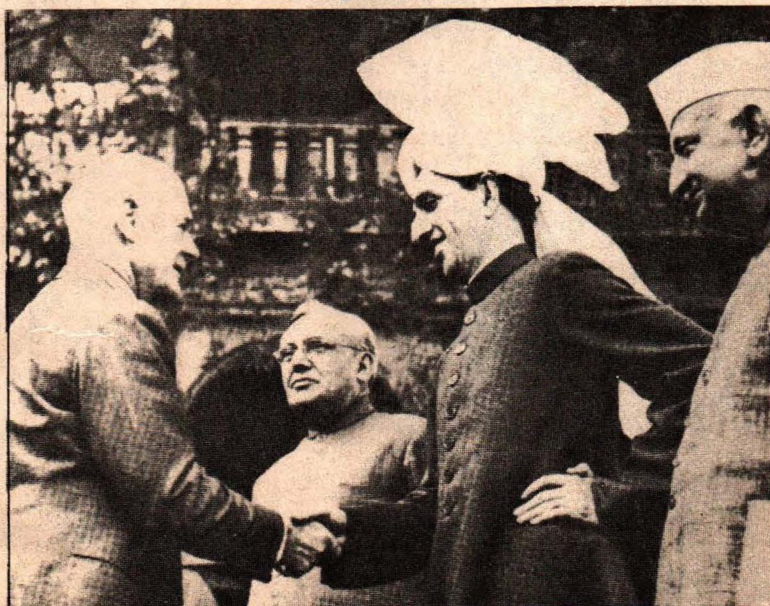
گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے حلف لے رہے ہیں۔
ایستادہ دائیں سے بائیں مولانا ابوالکلام آزاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، لیڈی ماؤنٹ بیٹن و دیگر



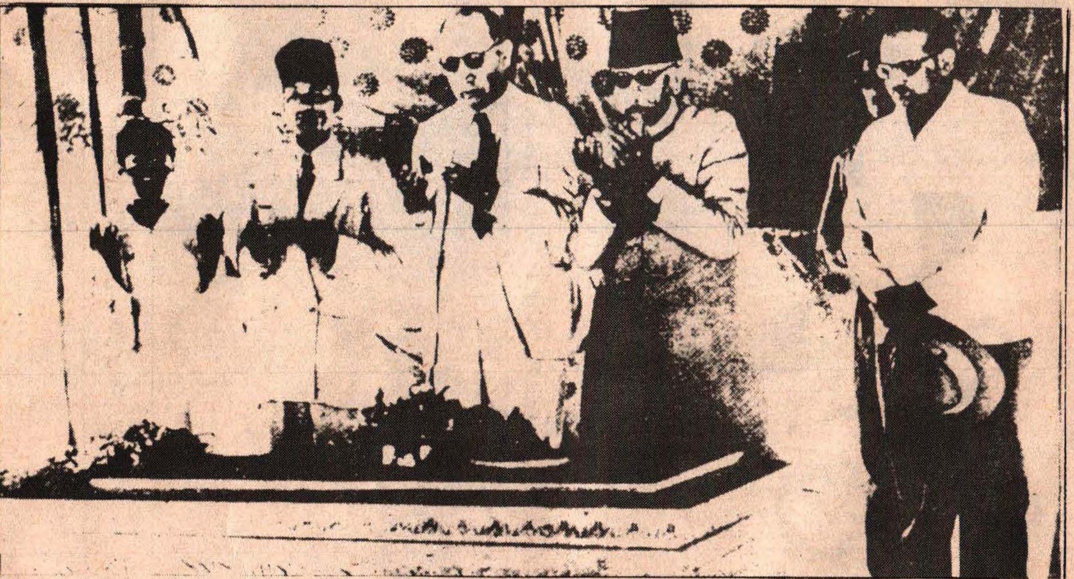
مولانا ابوالکلام آزاد، وزیرِ تعلیم ہند، ہندوستانی پارلیمنٹ کے اجلاس میں.
ان کے ساتھ وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو بیٹھے ہیں۔



سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ



لارڈ ویول، ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم صوبہ سرحد، سر خضر حیات خان ٹوانہ وزیر اعظم غیر منقسم پنجاب اور بھولا بھائی ڈیسائی قائد کانگریس پارلیمانی پارٹی مرکزی اسمبلی۔



مولانا ابوالکلام آزاد۔ قائداعظم کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۵۱ء

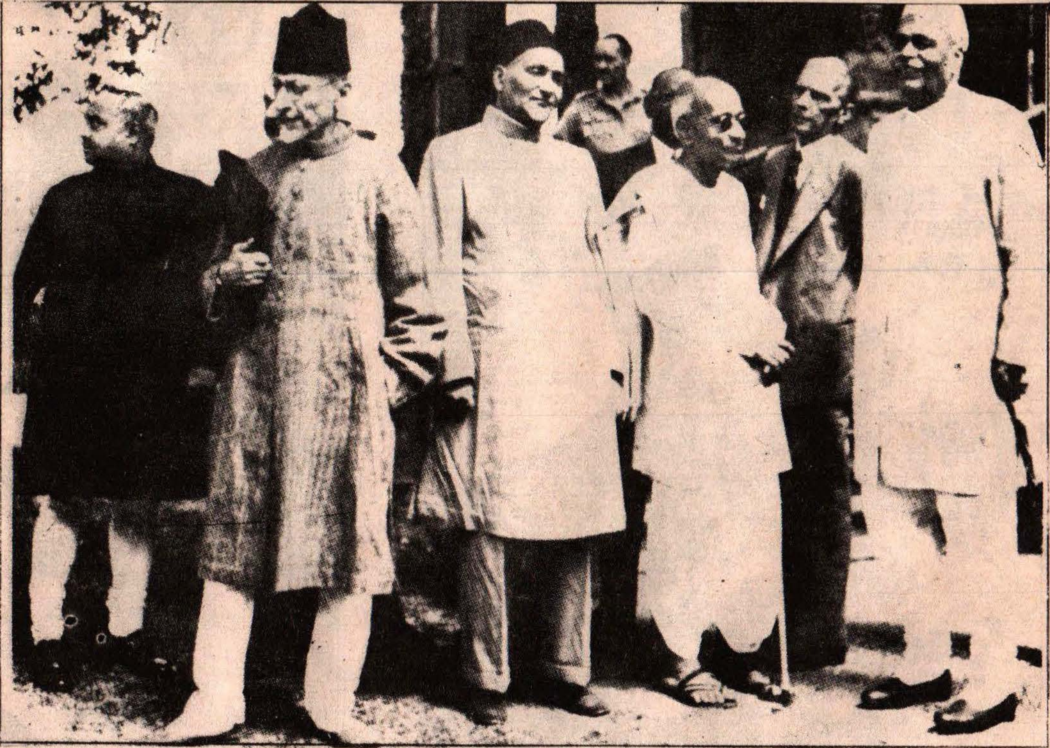


صدرِ کانگریس اور آصف علی صاحب کی کابینہ مشن سے ملاقات

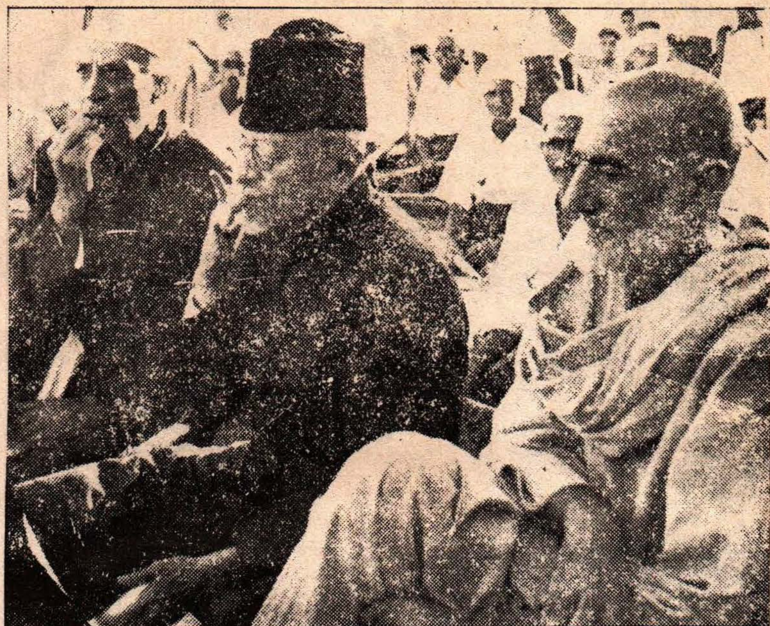
بائیں سے دائیں لارڈ پیتھک لارنس، مولانا آزاد، آصف علی صاحب، مسٹر اے وی الیگزینڈر، سر اسٹیفورڈ کرپس



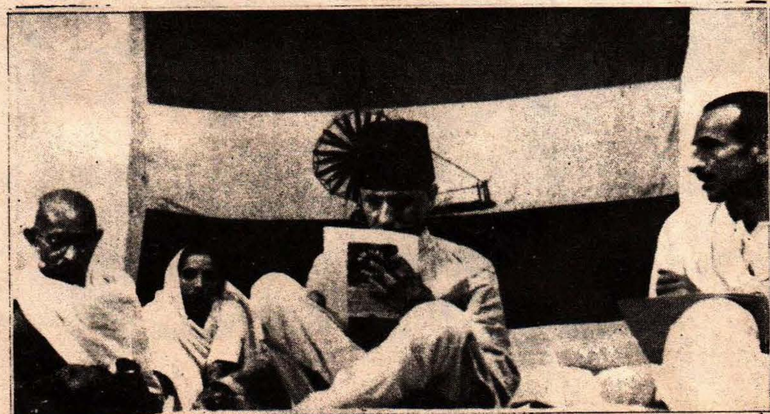
مولانا آزاد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں۔ بمبئی جولائی ۱۹۴۶ء



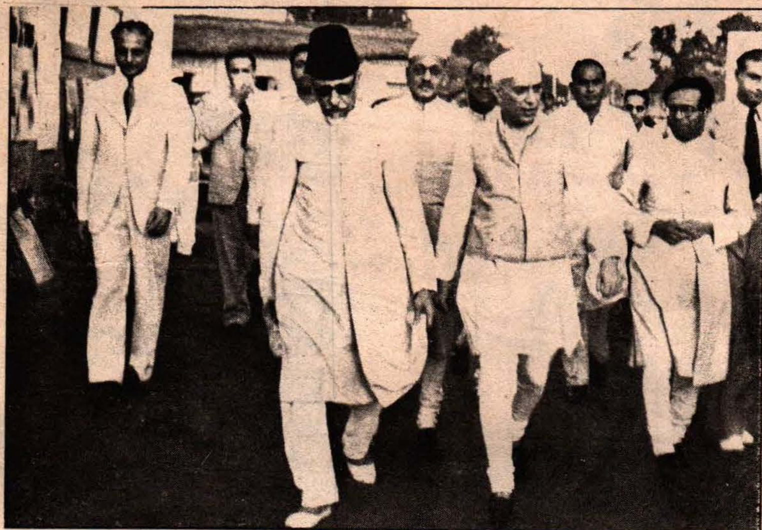
پہلی شملہ کانفرنس کے موقع پر وائسرائیگل لاج شملہ   دائیں سے بائیں خواجہ ناظم الدین، مولانا ابوالکلام آزاد، سر سعد اللہ، راج گوپال اچاری، قائداعظمؒ اور پنڈت پنتھ۔ جولائی ۱۹۴۵ء



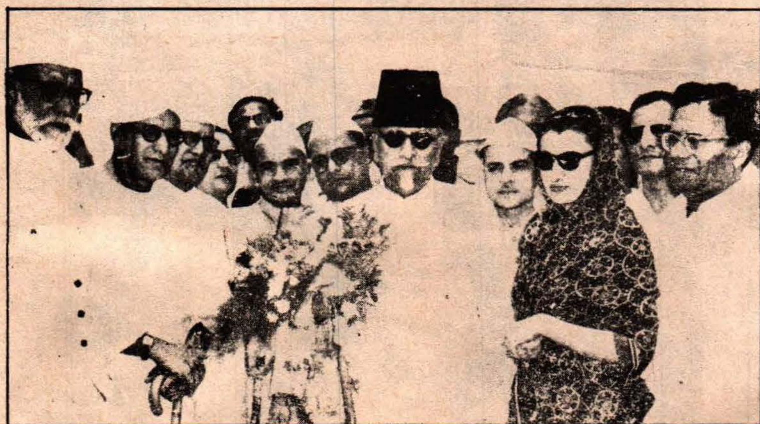
خان عبدالغفار خاں ' خدائی خدمت گار رہنما ' مولانا ابوالکلام آزاد ' پنڈت جواہر لال نہرو۔



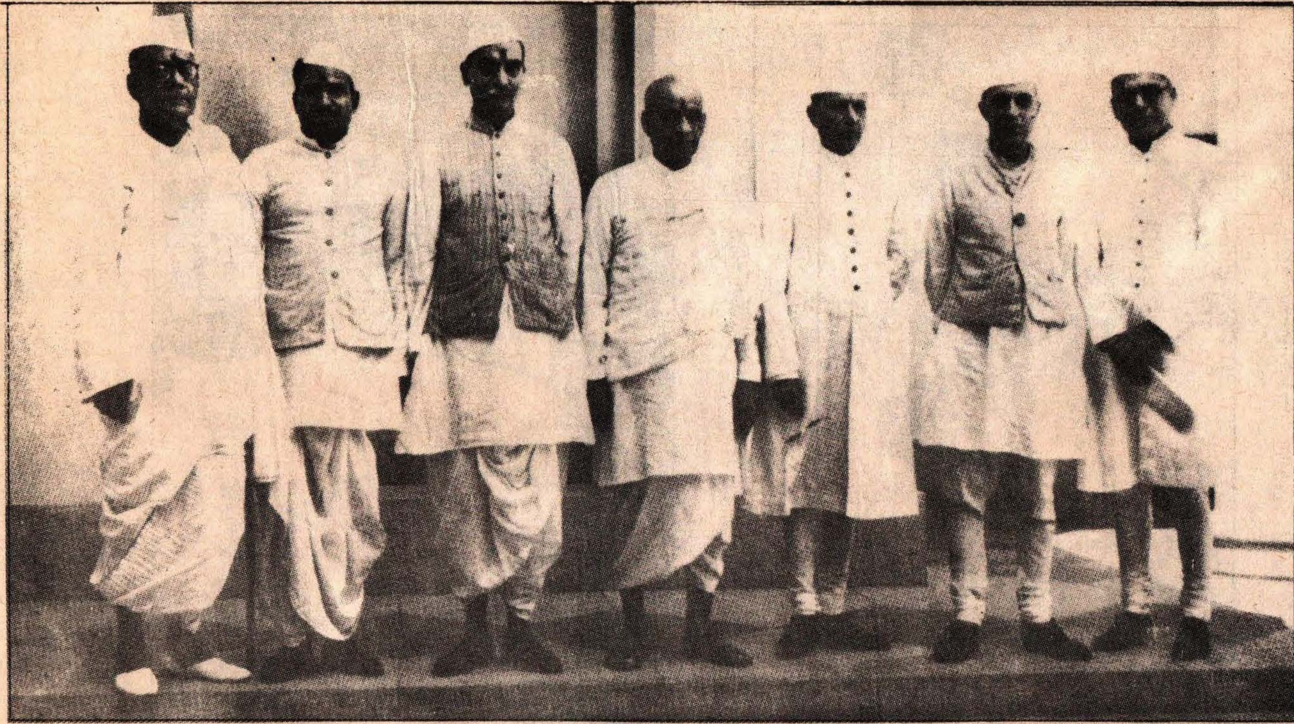
بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی اور اچاریہ کرپلانی کے ساتھ ۔ اگست ۱۹۴۲ء



مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اس موقع پر جب مولانا نے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن دہلی کا سنگِ بنیاد رکھا۔



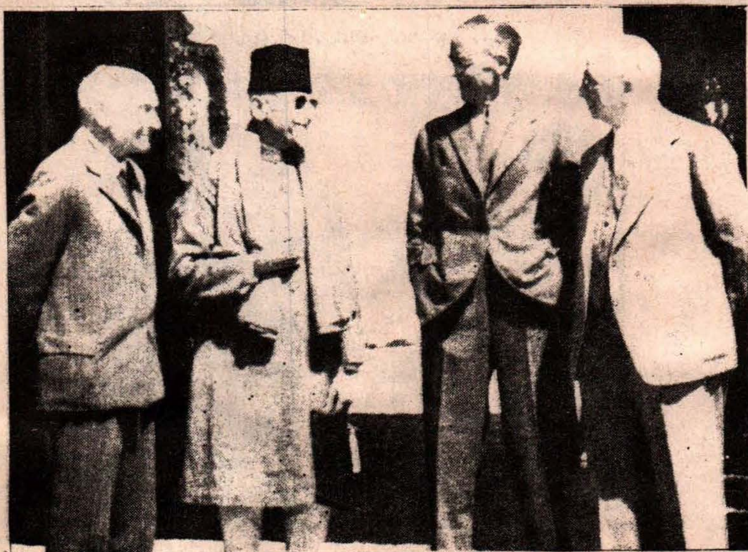
مولانا آزاد پالم کے ہوائی اڈے پر انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کے دورے سے واپسی کے وقت



عبوری حکومت کے کانگریسی وزراء۔ دائیں سے بائیں سید علی ظہیر، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر ایم آصف علی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مسٹر جگ جیون رام، مسٹر سرت چندر بوس۔



مولانا ابوالکلام آزاد اور لارڈ پیتھک لارنس دوسری شملہ کانفرنس کے موقع پر شملہ میں۔ ۵ر مئی ۱۹۴۶ء



صدرِ کانگریس مولانا آزاد وائسریگل لاج میں

دائیں سے بائیں اے وی الیگزینڈر، سر اسٹیفورڈ کرپس، مولانا آزاد، لارڈ پیتھک لارنس۔ ۵ر مئی ۱۹۴۶ء



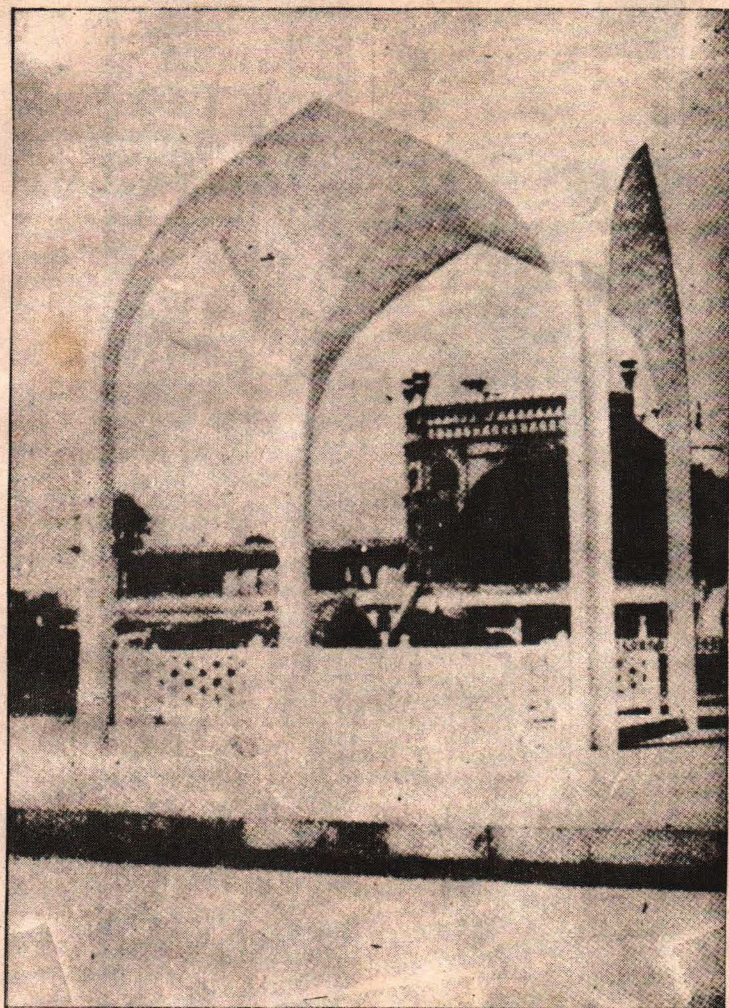
مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور اچاریہ کرپلانی



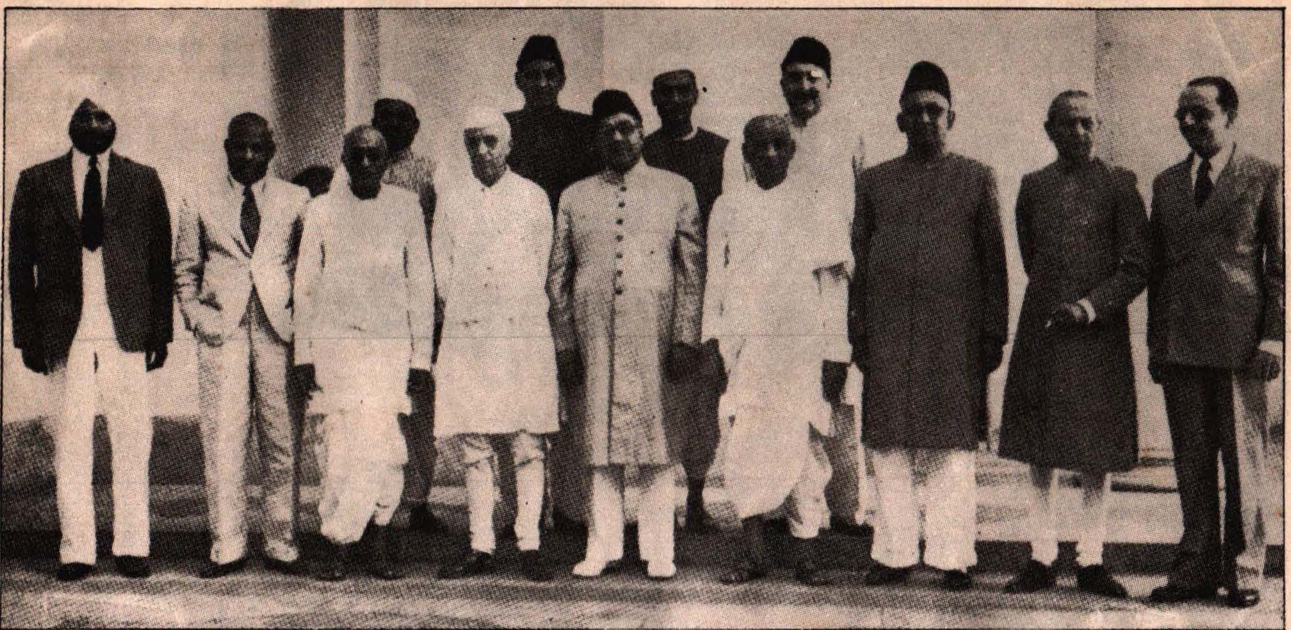
مغربی ایشیا کے دورے کے موقع پر ایرانی راہنما آیت اللہ خمینی کے ساتھ - ۱۹۵۱ء



مولانا آزاد کا سفرِ آخرت



مولانا کی آخری آرام گاہ



The new Government reconstituted to include Muslim League nominees, 26 October 1946

Left to right: Sardar Baldev Singh, Dr. J. Matthai, Mr. C. Rajagopalachari, Mr. Jagjivan Ram, Pandit Nehru, Mr. Ghazanfar Ali Khan, Nawabzada Liaquat Ali Khan, Dr. R. Prasad, Sardar V. Patel, Sardar Abdur Rab Nishtar, Mr. I. I. Chundrigar, Mr. M. Asaf Ali, Mr. C. H. Bhabha.



Liaquat Ali Khan and Mr. Jinnah in London, December 1946

قائد اعظمؒ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں لندن میں دسمبر ۱۹۴۶ء